قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط وکتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
لِمَ تقولون	عبداللہ ثانی	۳
قومی اخبارات اور جمہوریت	ڈاکٹر سید عبدالودود	۱۰
ڈاکٹر اسرار احمد کا تفکر و تذکر	اعزاز الدین احمد خاں	۱۲
حرام کی کمائی	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۲۱
نفسِ واحدہ	ڈاکٹر سید عبدالودود	۳۵
نورِ مبین	ادارہ	۵۱
بچوں کے لئے	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۱
نظریہ پاکستان (انگریزی مضمون)	//	۶۳ ـ ۷۶
انگریزی مضمون	شمیم انور	۷۷
اشتہار کتب	ٹرسٹ	۷۹

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

فون۔ ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

اگست ۱۹۹۲ء

جلد ۴۵ ——— شمارہ ۸

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : ۱۰/- روپے

لمعات

۱۴ اگست کا پیغام

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ (۱۷/۱۴)

تو اپنا اعمال نامہ پڑھ۔ آج تیری اپنی ذات خود تیرے خلاف محاسبہ کے لئے کافی ہے۔

ہم ۱۴ اگست کو جشنِ مسرت منانے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دن جشن منانے کا نہیں بلکہ اپنا محاسبہ کرنے کا ہے۔ جب ہم اپنا محاسبہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ چیز اپنے اعمالنامہ کے ایک ایک صفحہ پر ابھرے ہوئے حروف میں لکھی ملتی ہے کہ ہمارے معاشرے کی خرابیاں اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ان کے علاج کی طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ یاد رکھئے! کسی قوم پر مایوسی طاری ہو جانا بڑی خطرناک علامت ہے۔

مایوسی کا نفسیاتی تجزیہ یہ ہے کہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہو رہا جو کچھ وہ چاہتا ہے تو اُسے غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب وہ بے بسی میں خود اپنی ذات کے خلاف غصہ نکالتا ہے تو اس سے افسردگی اور اندوہناکی پیدا ہو جاتی ہے جس کی انتہائی شکل خودکشی ہے۔ جب وہ اس چیز کے خلاف غصہ نکالے جو اس کی مایوسی کا باعث ہو تو اسے انتقام کہتے ہیں۔ اس سے سرکشی کے جذبات ابھرتے ہیں اور جب وہ ایسا نہ کر سکے تو غیر متعلقہ چیزوں کے خلاف غصہ نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ پاگل پن کی ابتدا ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت پاکستان میں بالعموم یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ مغموم لہٰذا غیر متعلق ہو بیٹھے ہیں، کچھ سرکش ہو رہے ہیں، کچھ پاگل۔ ایسی صورتِ حالات کو زیادہ دیر تک جاری رہنے دینا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔

پاکستان کی نگاہیں کسی ایسے مردِ مومن کو ڈھونڈھ رہی ہیں جو اس کی مایوسی کو اُمیدوں میں بدل دے۔ ایسا وہی کر سکے گا جو قرآن کو ہاتھ میں لیکر اٹھے گا اور دل کے پورے یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت آواز دے گا کہ

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ...

ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔

عبداللہ ثانی

لِمَ تَقُوْلُوْنَ

مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ (۶۱/۲)۔ سورۃ الصف کی یہ آیت ہماری قولی اور عملی زندگی کی عکاس ہے۔ آیت کا مفہوم کچھ یوں ہے:۔

"اے جماعتِ مومنین! (جو کچھ اوپر کہا گیا ہے) اس پر غور کرو اور دیکھو کہ کائنات کا یہ کارگہ عظیم تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ اس میں ہر شے اپنے اپنے عمل سے بتاتی ہے کہ اس کے فرائض کیا ہیں۔ لہٰذا، تم بھی اپنے دعویٰ ایمان کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کرو۔ ایسا کبھی نہ کرو کہ) زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے رہو اور انہیں عملاً پورا کر کے نہ دکھاؤ۔ جو کچھ زبان سے کہو اسے عمل سے پورا کر کے دکھاؤ۔ قول و فعل میں ہم آہنگی دعویٰ ایمان کی صداقت کا ثبوت ہے۔"

قرآن کریم ایک آیت اور کبھی کبھی ایک ہی لفظ میں اتنی بڑی حقیقت کا اظہار کر دیتا ہے جس کی تفصیل طے کرنے میں انسانی ذہن صفحوں کے صفحے بھر دینے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بیان کر سکتا جو قرآن کہنا چاہتا ہے۔ انسانی تشریح میں وہ جامعیت پھر بھی نہیں ہوتی جو قرآن کریم ایک لفظ میں بیان کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مفہوم ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف سب سے اہم بات جو ذہن نشین کرنا ہوگی وہ یہ کہ خدا کے کلام کا ترجمہ بہرحال انسان نے ہی کرنا ہوگا جو یقیناً ناممکن ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان موجود فاصلے کو پاٹنا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم آئے دن انگریزی سے اردو یا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کئے ہوئے ناولوں کو جب دیکھتے ہیں تو واضح طور پر یہ فرق محسوس کرتے ہیں۔ جو شیرینی کسی زبان کے اصلی "ٹیکسٹ" میں ہوتی ہے وہ ترجمہ میں کسی صورت میں بھی نظر نہیں آتی۔ محولہ آیت پر پھر غور کیجئے! کہ اس آیت نے غور کے دریچے کھولنے کی دعوت دی ہے۔ اس کا سادہ ترجمہ یہی ہو سکتا ہے کہ "مت کہو وہ جو کرتے نہیں ہو" لیکن اس میں وہ "چس" نہیں جو آیت میں موجود

موجود ہے۔ پانچ الفاظ پر مشتمل اس آیت نے ہمارے قول اور فعل کے تضاد کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ ہمیں یہ درس دیا جا رہا ہے کہ جب تک تمہارا دم اور قدم ہم آہنگ نہیں ہوں گے، جب تک تمہارا عمل تمہارے قول کا آئینہ دار نہ ہوگا، جب تک تم جو کچھ کہتے ہو وہ کر کے نہیں دکھاتے، اس وقت تک تم ترقی کی معراج کو نہیں چھو سکتے۔ ذلت تمہاری تقدیر ہوگا۔

آیئے چند مثالوں سے قول و فعل کا یہ تضاد بازارِ تضادات میں تلاش کریں۔ بظاہر یہ تضادات زندگی میں معمولی شے نظر آتے ہیں لیکن عملی طور پر یہ چھوٹے چھوٹے تضادات ہمارا مذاق اڑاتے ہیں اور ہمیں ایک قدم آگے جانے کی بجائے دس قدم پیچھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ آپ عملی زندگی میں ہر روز محسوس کرتے ہیں۔ بازارِ تضادات میں آپ اگر کسی بھی سفید چیز کو خرید رہے ہوتے ہیں تو خریدنے کے فوراً بعد وہ سیاہ رنگ میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اس طرح جب آپ ہوش میں آتے ہیں تو پانی کی جگہ آگ سے پیاس بجھا رہے ہوتے ہیں۔ لیجئے۔

آپ آئے دن بلکہ ہر جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں مولوی صاحب کی زبان مبارک سے یہ جملہ سنتے ہیں کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھایئے! "یا اللہ تُو اسرائیل کو تباہ کر دے ان کی توپوں میں کیڑے ڈال دے۔ کفار کی بربادی کا سامان بنا دے"۔ سب نمازی زور سے کہتے ہیں آمین ثم آمین۔

آپ نے غور کیا۔ نہ تو مولوی صاحب کو ہوش ہے اور نہ ہی نمازیوں کو — کہ یہ دعا نہیں بلکہ بددعا ہے۔ ہے نا تضاد۔ اس کے علاوہ "مخلوط" دعا اور بددعا" بھی ہے۔ جس میں کہا جاتا ہے۔ کفار کو برباد اور اسلام کو ترقی نصیب کر۔ آمین۔ اس قسم کی دُعا پر خود خدا بھی ہنستا ہوگا کہ مانگتے دعا ہو اور دیتے بددُعا ہو — واہ وا) —

آپ ٹیلی وژن پر ہر روز سگریٹ کا اشتہار دیکھتے ہو جو بعض اوقات دس دس منٹ کا ہوتا ہے۔ خوبصورت چہرے قیمتی سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے دکھلائے جاتے ہیں۔ (یہ تو کمرشل بات ہے) لیکن ثواب کی خاطر پانچ سیکنڈ کا اشتہار آجاتا ہے کہ "سگریٹ نوشی صحت کے لئے مضر ہے۔ وزارتِ صحت"۔ یا للعجب — یہ کیا تضاد ہے۔

اخبارات اور ٹیلی وژن پر اکثر کسی وزیر کے حوالے سے یہ جملہ پڑھا اور سُنا جاتا ہے کہ "چور بازاری کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی"۔ ذرا غور کیجئے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اجازت کی گنجائش موجود ہے یا اس کی اجازت بھی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔

مجھے ایک بار انسدادِ سگریٹ نوشی کی تقریب میں شمولیت کا موقع ملا۔ دس مقررین نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایسا زہر اگلا کہ سگریٹ نوشی تو دُور کی بات رہی سگریٹ کو دیکھنے سے بھی نفرت ہوئی۔ تقریب چائے کے وقفہ کے لئے ملتوی ہوئی، تو تمام مقررین سگریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ تقریب انتہائی کامیاب رہی۔ آپ خود سوچئے اسے کیا کہیں گے۔

حکومت نے فلاں فلاں شخصیات کی سیاہ کاریوں کا "قرطاس ابیض" شائع کر دیا جس میں عام طور پر سیاہ کارناموں یا غلط کاریوں کی تفصیل موجود ہوتی ہے۔ جب کہ قرطاس ابیض کے معنی سفید کاغذ کے ہیں۔ (دراصل وائٹ پیپر کا ترجمہ کیا گیا ہے) حالانکہ سفید رنگ خود ایک واضح امن آشتی، بھلائی اور اچھائی کی علامت ہے۔ چونکہ ہم نے نقل تو کرنی ہے اس لئے گوروں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ ریڈ کراس کا ترجمہ ہلالِ احمر کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہلال کبھی سُرخ نہیں ہوتا۔ سفید بھی نہیں ہوتا لیکن سفید نظر آتا ہے۔ کتنا بڑا تضاد ہے۔

ہر روز یہ جملہ آپ کو سننے میں آتا ہوگا۔ کبھی نہیں سوچا کہ ایسا کہنا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ "میں نے قرآن پاک ختم کر لیا" دوسرا شخص اسے مبارک باد دیتا ہے۔ معاذ اللہ قرآن کو کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا۔ (یاد رہے۔ بابا جیؒ نے اس کے لئے جشنِ نزولِ قرآن کی اصطلاح شروع کی تھی جواب آہستہ آہستہ عام ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سہرا ان ہی کے سر ہے)۔

"سات لاکھ فرزندانِ توحید نے فریضۂ حج ادا کیا" فرزند فارسی کا لفظ ہے جس کی جمع فرزندان ہے۔ یہ صرف اور صرف اولاد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی دوسرے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ عیسائیوں کو ہم اس لئے مشرک کہتے ہیں کہ انہوں نے خدا کا ایک فرزند (عیسیٰ علیہ السلام) ہونے کا دعویٰ کیا۔ یا اب ابن اور روح القدس کا تصور پیش کیا۔ (خدا، عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ)۔ ہمارے ہاں ہر روز دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ لاکھوں فرزندانِ توحید نے فریضۂ حج ادا کیا۔ ذرا غور کیجئے۔ ہم عیسائیوں سے کتنا آگے نکل چکے ہیں۔ اب اگر اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ کہ فرزندانِ توحید سے مراد مسلمان ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ توحید کی اولاد نے ایسا کیا اور محض الفاظ کی ہیرا پھیری میں پڑنا نہیں چاہیئے تو یہی حق عیسائیوں کو بھی ملنا چاہیئے۔ پھر ان کو مشرک کہنے کا کیا جواز ہے۔ الفاظ ہی تو ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھانے میں مدد کرتے ہیں۔ اس پر آپ بھی غور کیجئے۔ ہے نا تضاد!

آیئے! ذرا ریل کا سفر کریں۔ جب ہم پشاور یا کراچی سے لاہور کے لئے اپنے سفر کا آغاز کریں، تو عام طور پر ریل میں بیٹھے ہوئے مسافر ایک دوسرے کو یہی کہتے ہیں "کہ یہ لو لاہور آگیا" آپ نے غور کیا لاہور نہیں آیا۔ ہم لاہور کے پاس آئے ہیں۔ ذرا دُور ہو تو کہا جاتا ہے۔ "لاہور آرہا ہے" لاہور کبھی نہیں آرہا ہوتا۔ ہم جا رہے ہوتے ہیں۔ ہیں ناں ہم اُلٹے!

ہماری مشکل ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ہم

خدا کو مانتے ہیں ـــــــ خدا کی نہیں مانتے۔
رسول کو مانتے ہیں ـــــــ رسول کی نہیں مانتے۔
قرآن کو مانتے ہیں ـــــــ قرآن کی نہیں مانتے۔

دوڑتے ہوئے آکر کہتے ہیں "نماز پڑھ آیا ہوں" کبھی کسی نے نماز (الصلوٰۃ) قائم نہیں کی۔ پھر پڑھی وہی چیز جاتی ہے جو کم از کم کتابی شکل میں ہو یا کسی تحریری شکل میں ہو، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ پڑھتا ہوں، پڑھ چکا ہوں، پڑھ آیا ہوں، پڑھوں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تو صورت بالکل اُلٹی ہے۔ نماز آپ کو زبانی یاد ہوتی ہے اور آپ آہستہ آہستہ سہی سنا کر آتے ہیں۔ خود بھی سنتے ہیں اور خدا کو بھی سناتے ہیں۔ اب اگر سنتے ہیں تو خدا بھی تو سنتا ہے — اور یقیناً سنتا ہے کہ وہ آپ کی رگِ جان سے بھی زیادہ آپ کے قریب ہے۔ اب جیسے آپ کسی بچے کو کہیں کہ بیٹا! کہانی سناؤ — وہ زبانی سنانا اس لئے شروع کر دیتا ہے کہ اُسے زبانی یاد ہوتی ہے۔ (آہستہ یا تیز یہ دوسرا مسئلہ ہے) کیا یہ موزوں نہ ہوگا کہ ہم اس اصطلاح کو رائج کریں کہ "نماز سُنا آیا ہوں" یا سنانے جا رہا ہوں۔ بعض حالات میں تو بچہ یہ بھی نہیں جانتا کہ جو کہانی میں نے سنائی ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ اسی طرح پچانوے فیصد سے زائد لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا سُنا رہے ہیں۔ بس سنا کر آجاتے ہیں۔ اس کے لئے پشتو میں "کوم" کی اصطلاح عام ہے جس کے معنی کرنے کے ہیں۔ جب کہ انگریزی میں لفظ "OFFER" یعنی پیش کرنے کے معنی میں نماز یا دُعا کے لئے استعمال ہوتا ہے جو سب کے سب عربی کے مفہوم "اقیمو" کے بالکل برعکس ہیں۔ اس لئے سوچنا ہوگا کہ بات کچھ اور ہی نہ ہو۔ کیسا لگا یہ تضاد!

اب ذرا پشتو اور اردو کے مروجہ چند الفاظ یا جملوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

مُرے شوہدے	میت ہوئی ہے۔
ماشوم شوہدے	بچہ پیدا ہوا ہے۔
وادہ شوہدے	شادی ہوئی ہے۔

ذرا ان پر غور کیجئے: تینوں جملے اپنی گہرائی کے اعتبار سے ایک، دوسرے کے کتنے برعکس ہیں۔ صرف درمیانہ نقرہ صحیح نظر آتا ہے جبکہ باقی دو بالکل متضاد۔ ان چند مثالوں کے دینے کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ ہماری رگ و پے میں خود اپنی مخالفت سرایت کر گئی ہے۔

قرآن کریم جھوٹ بولنے کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور کئی مقامات پر جھوٹوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں ضرورت کے تحت جھوٹ بولنے کی کھلی اجازت ہے۔ جسے آپ کسی بھی مذہبی کتاب یا فقہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے"۔ حالانکہ سچ ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ یاد رکھئے اگر سچ ہے تو میٹھا ہے اور جھوٹ ہے تو کڑوا ہوگا۔ کیسا رہا یہ تضاد!

ہماری عدالتوں میں گواہ جب اپنی شہادت شروع کرتا ہے تو اُسے قسم دی جاتی ہے (حالانکہ یہ کوئی چیز نہیں جو دی جائے)۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قسم اٹھائی جاتی ہے لیکن یہ تو کوئی وزن نہیں۔ (بہرحال ایک نسبت سے

بہت بڑا وزن ہے)" میں خدا/ اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا" (کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ یہ کوئی مٹھائی تھی جو آپ نے کھائی)۔ اس کے باوجود اس کی قسم پر اعتبار نہیں کیا جاتا اور ملزم کو سزا دے دی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گواہ پر جرح بھی کی جاتی ہے۔ آپ نے غور فرمایا۔ کتنا بڑا تضاد ہے۔ یا تو قسم دینا جھوٹا فعل ہے یا پھر گواہ جھوٹا ہے جس پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ دونوں عمل بیک وقت درست نہیں ہو سکتے ـــ اور تضاد کیسا ہوتا ہے؟

ہر سٹیج سے ہر سیاسی لیڈر جب تک یہ جملہ نہ کہے اس کی تقریر ادھوری ہوتی ہے۔ "اسلام زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔" ابھی لیڈر صاحب کی یہی سانس ختم نہیں ہوئی ہوتی کہ اسی سانس میں یہ کہتا ہے "ہمارا ملک مسائل کا شکار ہے اس کے لئے حل ڈھونڈنا پڑے گا" اس تضاد پر غور کیجئے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ہمارا ایمان یا اسلام علیٰ وجہ البصیرت نہیں بلکہ ہم عقیدتاً مسلمان ہیں ـــ اور بس ـــ

ہر روز آپ کو گلیوں، محلّوں، بازاروں بلکہ زیادہ تر مسجدوں کے دروازوں پر کچھ اس قسم کے جلی حروف میں لکھے ہوئے اشتہار نظر آئیں گے۔ "فرقہ بندی شرک ہے، خدا کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو ـــ ایک ہو جاؤ اور نیک ہو جاؤ ـــ وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو فرقہ بندی میں تقسیم ہو چکی ہو" اور اشتہار کے آخر میں ہوگا۔ منجانب جماعت المسلمین ـــ اہل سنّت والجماعت ـــ فرقۃ التوحید ـــ اہل حدیث (فلاں گروپ) لاہور ـــ جماعت اسلامی تحریکِ پاکستان پارٹی ـــ جمیعتہ العلمائے اسلام ـــ جمیعتہ العلمائے پاکستان ـــ فلاں دیوبندی ـــ فلاں بریلوی نقشبندیہ چشتیہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ ثم وغیرہ ـــ

قرآن کا ارشاد ہے کہ مساجد اللہ کے لئے ہیں۔ اللہ کے بغیر کسی اور کو وہاں دعوت مت دو (۷۲/۱۸)۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ تقریباً ہر مسجد پر لکھا ہوتا ہے۔ مسجد حنفی، مسجد اہل حدیث، مسجد بریلوی، دیوبندی مسجد۔ "اس مسجد میں صرف اہل سنّت والجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں"۔ لاہور کی ایک مسجد میں ٹریفک لائٹ کے اصول پر نماز ادا کرنے کی ہدایت درج ہے۔ یعنی سرخ بتی جل رہی ہو تو نماز پڑھنا منع ہے"۔ تم ہی بتاؤ کہ بتاؤں کیا؟

مجلّہ طلوعِ اسلام جولائی ۹۲ء صفحہ ۶۵ پر کسی صاحبِ دل نے یہ استفسار کیا ہے کہ " نہ جانے کیوں ہماری قوم بے حد جذباتی ہو چکی ہے۔ بے حد زود رنج ہے۔ جلد باز، بات بات پر بگڑ جانے والی، کوئی کسی کو برداشت نہیں کرتا، جوش و خروش اتنا زیادہ اور استقامت اس قدر کم، ایک ضرب المثل کے مطابق، پہل ہماری شیر کی ہوتی ہے اور پچھاڑ گیدڑ کی بھی نہیں رہتی۔ تقریریں سنئے تو ہلاکو خان اور چنگیز خان کے چھکے چھڑا دیں گے۔ لیکن اس کے بعد عمل دیکھئے تو کہیں حرکت نام کو نہیں ـــ الخ

ہم کلاشنکوف کلچر کے خاتمہ کے لئے لمبی لمبی تقریریں جھاڑ دیتے ہیں لیکن کلاشنکوف کے لائسنس کے حصول کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے مناصب کا خیال بھی نہیں رکھتے ـــ ہم رسولؐ کو پیوند لگے ہوئے کپڑے تقاریر

میں پہنا دیئے ہیں لیکن اپنے کپڑوں کے کلف کی آواز خود بھی سنتے ہیں اور دوسروں کو بھی سناتے ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟ یہی کہ ہمارے قول اور فعل میں تضاد رچ بس گیا ہے! ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ عملی دنیا میں کرنے سے قاصر ہو چکے ہیں۔ پشاور میں اپریل سن ۱۹۹۲ء کے بعد پہلی بار مذہبی فرقہ واریت کی گولی دس محرّم کو چل گئی جس کے نتیجے میں چھ مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں چلی ہوئی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ سب مسجد کے صحن میں ہلاک/شہید ہوئے اور چودہ زخمی ہوئے۔ جس قرآن پر سب متفق ہیں اسی قرآن کو پاؤں تلے روندا گیا، آگ میں ڈالا گیا، مسجد کو آگ لگا دی گئی۔ حالانکہ محرم سے چند دن پہلے اور خود محرّم کے دوران پشاور میں پہلی بار خواتین کو فرقہ واریت کے خلاف اور اتحاد بین المسلمین کے حق میں اشتہارات دیواروں پر لگاتے ہوئے دیکھا گیا۔ بظاہر لیپا پوتی اور درونِ قلب بغض وحسد اور مذہبی ضد وکینہ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر ـــ ہندو مسلم فساد کی بات تو قابلِ فہم ہے ـــ یہ شیعہ سُنّی فساد کا کیا مطلب ہے؟ یعنی قولی دنیا میں کچھ اور عملی دنیا میں کچھ ـــ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ـــ

حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کے متعلق بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے کہ دین نے مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سارے مذہب کی بنیاد عقیدہ پر ہے اور عقیدہ جس کا جو بھی ہے وہی اسے سچا سمجھتا ہے۔ عقیدہ وجذبات لازم وملزوم ہیں جب کہ دین علیٰ وجہ البصیرت ایک تیقّن کا نام ہے۔ دین نے علیٰ وجہ البصیرت دو اور دو کا جواب چار دیا ہے لیکن مذہب اس کا جواب کبھی پانچ اور کبھی تین، ضرورت پڑے تو بائیس بھی دے دیتا ہے۔ بس یہی فرق ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا ۝

(۲۵/۷۳)

مفہوم:۔ یہ لوگ یونہی جذبات کی رَو میں نہیں بہ جاتے بلکہ اپنا ہر قدم، پورے غور وخوض کے بعد اٹھاتے ہیں (۴۲/۳۸) یہاں تک کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی بھی پیش کئے جائیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ علم وبصیرت اور عقل وفکر کو بالائے طاق رکھ کر، محض جذباتی طور پر ان پر گر پڑیں، وہ انہیں بھی اندھے، بہرے بن کر اختیار نہیں کرتے، سوچ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں (ظاہر ہے کہ یہ لوگ جب قوانینِ خداوندی پر بلا سوچے سمجھے عمل نہیں کرتے، تو زندگی کے دوسرے معاملات کے فیصلے بے سوچے سمجھے کیسے کریں گے؟)

اب چونکہ نتائج کا وقت قریب آ چکا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ کوئی عمل فوری طور پر اپنا اثر دکھا دے گا بالکل ناممکن ہے۔ اعمال کے نتائج مرتب ہونے میں صدیاں لگتی ہیں۔ مسلمانوں کی ریل کو پٹڑی سے علیحدہ ہوئے بھی تو ایک ہزار سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے اس ریل نے کہیں تو جا کر رُکنا تھا سو رُکی ہوئی ہے۔

ایجوکیشن کے نام پر مسلمان ہر قدم پر "انفارمیشن" حاصل کرتے رہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایجوکیشن تعلیم کو کہتے ہیں اور انفارمیشن اطلاع کو کہا جاتا ہے۔ مثالیں حاضر ہیں ـــ

دوسری جماعت کے بچے کو ہم ایجوکیشن کے نام پر یہ انفارمیشن دیتے ہیں ـــ کہ پنجاب پانچ دریاؤں کی وجہ سے مشہور ہے ـــ مسلمانوں کا متبرک مقام خانہ کعبہ ہے ـــ قرآنِ کریم میں ۱۱۴/۱۱۳ سورتیں ہیں ـــ حضورؐ کو پہلی وحی غارِ حرا میں ملی (یاد رہے کہ مکّہ مکرّمہ میں موجود غارِ حرا باضابطہ یا سرکاری سطح پر مسلّمہ نہیں ہے ـــ وہاں پاکستانی پیٹرول نے اپنے ہاتھ سے خوش خط غارِ حرا لکھ دیا ہے۔ سرکاری سطح پر ایسی کوئی اطلاع وہاں نصب نہیں کی گئی)۔

اس کے مقابلے میں بچے کو جب ایجوکیشن دی جائے گی تو اس کے سینے سے خود بخود علم کے سوتے پھوٹیں گے۔ وہ راستہ میں موجود ہر رکاوٹ، جو انسانیت کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو سکتی ہے کو ہٹانا اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔ ایجوکیشن ملنے پر گلی گلی، محلّے محلّے، قریہ قریہ سائنس دان، فلاسفر، تاریخ دان، عالم، فاضل، ایجوکیشنسٹ اور نامور لوگ پیدا ہوں گے۔ جبکہ انفارمیشن صرف سیاسی لیڈر تو پیدا کر سکتی ہے جو عوام کے جذبات کو گٹھ پتلیوں کی طرح استعمال کر سکیں۔ جو مولویوں کی کھیپ مذہبی فیکٹریوں (دارالعلوموں) سے تو نکال سکتی ہے۔ لیکن کسی رہنما کو پیدا نہیں کر سکتی ـــ اسی طرح انفارمیشن ثواب کا کام تو کر سکتی ہے مگر تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔

یہ اور اس قسم کی سینکڑوں مثالوں سے بات سمجھائی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفارمیشن سے عقیدہ بنتا ہے اور ایجوکیشن سے علیٰ وجہ البصیرت ایمان کی پختگی پیدا ہوتی ہے۔ انفارمیشن آپ کو مسلمان تو بنا سکتی ہے ـــ مومن نہیں ـــ مومن بننے کے لئے ایجوکیشن ازبس ضروری ہے۔ کوئی شخص تجرباتی طور پر بھی زہر نہیں کھاتا کہ علیٰ وجہ البصیرت اس کا یہ ایمان بنا دیا گیا ہے کہ زہر سے موت واقع ہوتی ہے اس لئے وہ چکھتا بھی نہیں جب کہ عقیدہ اسے ضرورت کے وقت جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا وہ دھڑلّے سے جھوٹ بولتا ہے اور پھر ضرورت ہر شخص کی اپنی اپنی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس سے جو معاشرہ پیدا ہوگا وہ جذباتی، زود رنج، تضادات سے بھرا..... نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟

ہمارے مولوی صاحبان تقریر کے آخر میں یا کسی بھی تحریر کے آخر میں "وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ" ضرور کہتے یا لکھتے ہیں۔ یعنی میرا کام آپ کو تبلیغ کرنا تھا (یا انفارمیشن دینا تھی) جس کا ثواب میں لے کما لیا۔ باقی آپ کی مرضی ـــ آپ پُر امن رہیں یا پُر فساد۔ میرا کام ختم ـــ کسی بھی اخبار کو اُٹھا کر دیکھئے ـــ حکومت اور مختلف مکاتب ہائے فکر۔ متضاد مذہبی فرقوں کی جانب سے بڑے بڑے اشتہارات امن کی بھیک مانگنے کے لئے چھپتے ہیں۔ لیکن جھولی میں ڈھیروں فساد گرتا ہے ـــ قرآنِ کریم تو کہتا ہے کہ قوانینِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے والوں کے لئے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ـــ ان کے لئے نہ خوف ہوگا نہ حزن ـــ لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ سب کچھ قول اور فعل میں موجود تضاد کا نتیجہ ہے ـــ بند کرو اس بازارِ تضادات کو ـــ قرآن کہتا ہے کہ ایک ایک اور دو دو کر کے قرآن پر سوچا کرو، سوچا کرو اور بس ـــ سوچا کرو ـــ

ڈاکٹر سید عبدالودود

قومی اخبارات اور مغربی جمہوریّت

جس "سسٹم" کا ذکر یہ اخبارات عرصہ دراز سے کرتے چلے آرہے ہیں، کیا یہ ایک بیکار مشغلہ نہیں ؟ مغربی جمہوریت کا سسٹم دنیا میں اپنے بداثرات دکھا چکا ہے۔ یہ ڈاکے، چوریاں، قتل، چھین چھپٹ، تشدّد، ظلم، عوام کی فاقہ کشی، سب مغربی جمہوریت کے تحفے ہیں۔ یہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں جمہوریت کارفرما ہے، موجود ہیں۔ ہر جمہوری ملک بدمعاشی پر تُلا ہوا ہے۔ امریکہ ہو یا ہندوستان، جمہوری غنڈے دنیا کے ہر حصے میں اپنی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر انسانی جانوں کو بے دریغ تلف کر رہے ہیں۔ ان کا اصل مقصد جو کہ ظاہر ہے ذرائع پیداوار اور معیشت پر قبضہ جمانا ہے۔ ادھر پاکستان کا ایک ڈاکو کسی شہر یا قصبے میں چند ہزار یا چند لاکھ سکوں کی خاطر ڈاکہ ڈالتا ہے، اُدھر امریکہ خلیج کے تیل کی خاطر دوسرے ممالک پر چڑھ دوڑتا ہے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ ادھر چند تخریب کار ۳ یا ۶ یا ایک ایک دو دو کرکے معصوم بچوں اور عورتوں کو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ اُدھر امریکہ گولہ بارود سے لاکھوں بچوں، عورتوں کو ایک ہی رات میں موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان ہزاروں کی تعداد میں اپنے ہی ملک کے مسلمانوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹتا چلا جاتا ہے یا کشمیری مسلمانوں پر ظلم و تشدد کا وہ بازار گرم رکھتا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان ہر دو قسم کے غنڈوں میں کوئی فرق نہیں اور اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ امریکہ کا جارج بُش یا ہندوستان کا لعگ موہن مہذب کہلاتا ہے اور پاکستان کا ڈاکو غیر مہذب۔

ہمارے اخبارات نام اسلام کا لیتے ہیں اور تائید اس سسٹم کی کرتے ہیں جو اسلام اور قرآنی نظام کی ضد ہے۔ کیا یہ ایک بھونڈا مذاق نہیں ؟ ہر روز یہ حکومت اور اپوزیشن کے مابین باہمی اشتراک کی وعظ فرماتے ہیں اور اسے ملک اور عوام کی تمام مشکلات کا حل تجویز فرماتے ہیں۔ کیا یہ بھی ایک مسخرا پن نہیں ؟ یہ کسی سسٹم کی جبلی قوت ہوتی ہے جو انسانوں کے اندر اشتراکِ عمل کے جذبے کو ابھارتی اور قائم رکھتی ہے۔ ایسا سسٹم وہی ہو

سکتا ہے جو وحی کا عطا کردہ ہو۔ انسانوں کے خود ساختہ سسٹم کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ انسانیت کو اشتراکِ عمل، مساوات اور حقوق العباد کی طرف راغب کر سکے۔ ہمارے اخبارات روزانہ اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کا راگ گاتے ہیں لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں فرق کیا ہے۔ دونوں میں فرق SOVERIEGNTY یا اقتدارِ اعلیٰ کا ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا ہے جو وحی کے ذریعہ عطا کردہ قوانین اور مستقل اقدار کو بروئے کار لاکر اسے عملی شکل عطا کرتا ہے۔ یہ قوانین اور مستقل اقدار قرآنِ کریم کے صفحات کے اندر موجود ہیں اور ان کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ دوسری طرف مغربی جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ خدائے واحد کا نہیں تسلیم کیا جاتا بلکہ ان سینکڑوں خود ساختہ "خداؤں" کا تسلیم کیا جاتا ہے جن کو آپ وقتاً فوقتاً اسمبلی کی نشستوں پر لاکر بٹھا دیتے ہیں۔ ان 'خداؤں' میں سمگلر بھی ہیں، ہیروئن کے تاجر بھی ہیں، ایسے تاجروں کے نمائندے بھی ہیں، سیاسی استحصال کرنے والے فرعون بھی، عوام کی ذہنیت کا استحصال کرنے والے ہامان بھی ہیں اور عوام کے خون پسینہ سے پیدا کردہ مال و دولت کو سمیٹنے والے قارون بھی ہیں۔ کیا آپ ان سے توقع رکھتے ہیں کہ یہ آپس میں مل بیٹھ کر ملک کے بگڑے ہوئے حالات میں بہتری کی صورت پیدا کر سکیں گے؟ یہ لوگ اگر بالفرض آپس میں مل بھی بیٹھیں (جو کہ ایک ناممکن صورت ہے) تو بھی ان کے لئے ملک اور عوام کی بہتری کی صورت پیدا کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ جس سسٹم کے اندر یہ کام کرتے ہیں وہی خرابی کی جڑ ہے۔ اس سسٹم کو جڑ سے اکھاڑیئے اور قرآن کے سیاسی نظام کی طرف توجہ دیجئے۔ اس میں ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ گو اس کے حصول کا راستہ کٹھن ہے اور محنت طلب ہے لیکن اس پر چلنا ناممکن نہیں بشرطیکہ عزم اور نیک نیتی موجود ہو۔

معاملہ صرف ذہنیت کو بدلنے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔ (القرآن ۱۳/۱۱)۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور نظام (سسٹم) کا خواہاں ہوگا وہ نظام قبول نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ کارگہِ کائنات میں فٹ ہی نہیں بیٹھ سکتا (۳/۸۵)۔

ہمارے قومی اخبارات سے استدعا ہے کہ اگر آپ حقیقتاً پاکستان میں اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کے خواہاں ہیں تو خدارا مغربی جمہوریت کی تائید کے بیکار مشغلے کو بند کیجئے اور قرآن اور صرف قرآن کی طرف رجوع فرمایئے۔ عزائم آپ کے نیک سہی لیکن راستہ آپ کا ٹیڑھا ہے۔ صراطِ مستقیم کی طرف لوٹیے۔ اس میں مملکتِ پاکستان اور اہلِ پاکستان کی بقا اور استحکام کا راز مضمر ہے۔

والسلام

عبدالودود

اعزاز الدّین احمد خاں

ڈاکٹر اسرار احمد کا
"تفکّر و تذکّر"

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق! (اقبالؒ)

"چند در چند مغالطے"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، امیر تنظیم اسلامی، کے "تفکّر و تذکّر" کا ایک نیا سلسلہ (جو اصل میں ان کے مضامین "جمہوریت نہیں، خلافت" کی ایک کڑی ہے) حال ہی میں ایک مقامی اخبار میں "عہدِ حاضر میں اسلامی ریاست کا دستوری خاکہ یا نظامِ خلافت" کے عنوان کے تحت، قسط وار شائع ہوا۔ اس سلسلے کی پہلی قسط "اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا کردار" میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کہنا کہ "اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا وجود ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ یہ تفرقہ اور انتشار کا سبب بنتی ہیں" چند در چند "مغالطوں" پر مُبنی ہے۔ ان کے مطابق "اس سلسلے میں اوّلیں اور عظیم تر مغالطہ، جو اکثر لوگوں کو لاحق ہوا ہے، یہ ہے کہ شاید عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست دورِ خلافتِ راشدہ کے نظام کی ہو بہو چربہ یا کاربن کاپی ہوگی"۔ اس "مغالطے" کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

> "واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ایک جانب خلافتِ راشدہ کا دور ہماری تاریخ کے عہدِ زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کے رشتے کا استوار ہونا عین ایمان کا تقاضا ہے لیکن دوسری جانب اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعض ایسے خصائص اور امتیازات ہیں جو اس کے نظامِ حکومت میں تو جزو لاینفک کے طور پر پیوست تھے لیکن اب دنیا میں دوبارہ کبھی وجود

میں نہیں آسکتے۔ مثلاً اوّلیں اور اہم ترین یہ کہ دورِ خلافتِ راشدہ دورِ نبوت کا ضمیمہ تھا اور اُس وقت کا معاشرہ نبیٔ اکرمؐ کی دعوت اور تربیت و تزکیہ کے مبارک اثرات و ثمرات سے مالامال تھا۔ اب دنیا میں دوبارہ دورِ نبوت آئے گا نہ اس کے آثار و برکات کا حاصل ضمیمہ یا تتمہ!"

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب، اپنی تجویز کردہ "خلافت المسلمین" کو مقبول بنانے کی دھن میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" کی اصطلاح کے صحیح مفہوم کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر، الجھا کر رکھ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" یا "خلافتِ راشدہ" کا مفہوم ہی نہ سمجھے ہوں ورنہ وہ "خلافتِ راشدہ" کو کسی خاص زمانے تک محدود کرنے کی بات نہ کرتے۔

خلافتِ راشدہ کا مفہوم

سیدھے سادے الفاظ میں "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" یا "خلافتِ راشدہ" اس اسلامی نظام مملکت کو علیٰ حالہ قائم اور جاری رکھنے کے طریقے کو کہتے ہیں جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا۔ جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآنِ حکیم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔ (۴۸/۲۹) حضورؐ کی وفات کے بعد، وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اب مرکزِ ملت، حضورؐ کا جانشین، خلیفۃ الرسولؐ یا امیر المومنین سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اس کی اطاعت فرض تھی۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینانِ رسالتمآبؐ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔

اگر بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اسے یوں سمجھئے۔ سلسلۂ وحی حضورؐ نبیٔ اکرم کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا۔ آپؐ کے بعد کسی رسول نے نہیں آنا تھا۔ دین، قرآنِ حکیم کی دفتین میں مکمل ہو گیا۔ قرآنِ حکیم کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا (۱۵/۹)۔ رسول اللہ نے قرآنی اصول و اقدار کے مطابق ایک نظام قائم کر کے دکھا دیا۔ سوال اٹھتا ہے کہ جو اسلامی نظامِ مملکت (نظامِ شورائیت) رسول اللہؐ کے زمانے میں قائم ہوا تھا کیا اسے حضورؐ کی زندگی تک ہی محدود رہنا تھا؟ ظاہر ہے کہ اسے حضورؐ کے بعد بھی علیٰ حالہ قائم اور جاری رکھا جانا مقصود و مطلوب تھا اور تعین و تغیرِ جزئیات کے لئے جو حکم حضورؐ کو دیا گیا تھا (۳/۱۵۸)۔ اس کے مطابق آپؐ کے بعد بھی عمل ہونا تھا۔ چنانچہ جس طرح رسول اللہؐ سے کہا گیا تھا کہ ان امور کا تعین باہمی مشاورت سے کیا کرو۔ جن کے بارے میں قرآنِ حکیم نے صرف اصول دیئے ہیں، اسی طرح جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے

طے کریں گے (۴۲/۳۸). گویا ملت کو اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق اپنے نظام کی رُو سے، کرنے ہوں گے، جس کا مدار شخصیتوں پر نہیں (۳/۱۴۴)۔ اس طرح یہ نظام قرآنِ حکیم کی بنیادوں پر آگے چلا۔ اس وقت فقہ اور روایات کے موجودہ مجموعے تو وجود میں ہی نہیں آئے تھے جنہیں ہم اب اپنے سروں پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ اُس وقت صرف کتاب اللہ تھی جسے مضبوطی سے تھام کر (۳/۱۰۲) قرنِ اوّل کی جماعتِ مومنین آگے بڑھی۔

حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے امورِ مملکت سرانجام دینے کا وہی طریقہ اختیار کیا جو رسولؐ اللہ کے زمانے میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ حکیم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن حکیم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طرح کو" خلافت علیٰ منہاج رسالتؐ" یعنی رسولؐ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر خلافت یا" خلافتِ راشدہ" کہا جاتا ہے۔ ایسی خلافت کسی خاص زمانے تک محدود نہیں۔

خلافتِ راشدہ کسی خاص زمانے تک محدود نہیں

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو، جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے، اس میں اُس کے سابقہ ادوار کے فیصلے علیٰ حالہ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو، ان میں اُس دَور کی حکومت ضروری تبدیلی کر لیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) قائم رہی، اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآنِ حکیم نے جب امورِ مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تو اس کا یہی منشا تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں (جس کا حوالہ ڈاکٹر صاحب نے بھی دیا ہے) جس میں نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا کہ

"تم پر میری سنّت اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنّت واجب ہے۔"

تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ "خلفائے راشدینؓ" کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے۔ اگر خلافتِ راشدہ مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے لے کر آج تک کے خلفاء، خلفائے راشدینؓ ہوتے۔ اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہو گیا ہے تو اُسے پھر جاری کیا جا سکتا ہے۔ جب وہی سلسلہ پھر قائم ہو جائے تو ان نئے خلفائے راشدینؓ کی سنّت کی اطاعت واجب ہو جائے گی۔ اس سے مراد ہوں گے وہ فیصلے جو یہ نظام قرآنِ حکیم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلے میں باہمی مشاورت سے کرے گا۔

اب امت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبویؐ میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ اللہ کا دین پاکستان میں

پوری دنیا میں) میں متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پالے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

تصریحاتِ بالا کی روشنی میں سوچیئے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ کہنا کہ "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت (خلافتِ راشدہ) اب دنیا میں وجود میں نہیں آسکتی" کہاں تک صحیح ہے؟ ڈاکٹر صاحب خلافتِ راشدہ کے تصور سے اس لئے الرجک ہیں کہ اس طریقِ خلافت کی موجودگی میں ان کی تجویز کردہ "خلافت المسلمین" کی بیل منڈھے چڑھ نہیں سکتی اور چڑھے بھی کیسے؟ "خلافتِ راشدہؓ" کے تحت نظام ہمیں خوشگوار مستقبل کی طرف لے جاتا ہے، جبکہ اُن کی تجویز کردہ "خلافت المسلمین" کا نظام ہمیں روشِ کہن کی دلدلوں میں دھکیلتا ہے ــــ "خلافتِ راشدہ" کی بنیاد قرآنِ حکیم پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی "خلافت المسلمین" کی بنیاد مذہب پر استوار ہوتی ہے جس میں فرقے ہیں، سیاسی پارٹیاں اور گروہ بندیاں ہیں۔ لیکن تسلی رکھیں ڈاکٹر صاحب انہیں جائز و حلال بنانے کا نسخہ بھی تجویز کرتے ہیں! (اگلی اقساط میں)۔

کاش ہم سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو وارننگ دی تھی، متنبہ کیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسولؐ کی وفات کے بعد پھر سے اس نظامِ کہن کی طرف نہ پلٹ جانا جس میں اللہ تعالیٰ کے بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی ہے (۳/۱۴۳)۔ اسلام نام تھا کتاب اللہ پر مبنی نظام، جس کا مدار شخصیتوں پر نہیں تھا اور نظامِ کہن سے مراد تھی شخصیت پرستی۔ یہ تھی وہ وارننگ جو اللہ تعالیٰ نے دی تھی۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ بعینہٖ وہی جس سے اللہ نے منع کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی وارننگ (تنبیہ)

رسولؐ اللہ نے ایک امت کی تشکیل فرمائی اور ایک مملکت قائم کی۔ چونکہ زمانہ قبل از اسلام کی تاریخِ انسانیت، شخصیتوں کے گرد گھومتی تھی، اس لئے، جماعتِ مومنین کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ اب تو یہ مملکت اس قدر مستحکم ہے، کل کو جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ اُمت میں اولوالعزم شخصیتیں موجود تھیں، لیکن وہ رسولؐ اللہ کا بدل تو نہیں ہو سکتی تھیں! صحابہؓ کے اس اندیشہ کے پیشِ نظر (بالخصوص اس لئے کہ اب رسولؐ اللہ خود لڑائیوں میں بھی شریک ہوتے تھے جہاں موت کسی وقت بھی آسکتی تھی) ان سے کہا گیا:-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ
اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ

يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۳)

اس آیہ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے:

"موت اور زندگی کے ضمن میں ایک اہم اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم اپنی زندگی اور قوت کا راز، اپنے نظام کے استحکام میں سمجھو۔ اسے شخصیتوں کے ساتھ وابستہ مت کرو۔ چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف اِس باب میں محمدؐ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے، اسی طرح، بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا، اگر یہ پیغام رسان (محمدؐ) بھی کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا؟ اور اس کے بعد اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ یاد رکھو! جو بھی ایسا کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو ایمان کی روش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدر شناسی کرے گا، تو اُسے اُس کی کوششوں کا پورا پورا صلہ ملے گا۔ یعنی اس نظام کو، رسولؐ کی موت کے بعد بھی، علیٰ حالہ قائم رکھنے سے۔ اُس وقت، رسولؐ کا جانشین وہی فرائض سرانجام دے گا جو فرائض اِس وقت یہ رسولؐ سرانجام دیتا ہے۔ اس دین (اسلام) آگے چلے گا۔"

حضورؐ کے بعد ہم (مسلمانوں) نے کیا کیا۔ یہ ایک دلگداز اور عبرت انگیز داستان ہے۔

حضورؐ کے بعد

حضورؐ کی تشریف براری کے بعد، قرآنِ حکیم کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے بعد اس کا تسلسل واستحکام وہ فرائض ہیں جو امت کے سپرد ہوئے۔ امت نے کچھ وقت تک اس فریضہ کو سرانجام دیا۔ لیکن اس کے بعد بدقسمتی سے، یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور اللہ کا دین (نظام) نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم شخصیتوں کی طرف پلٹ گئے۔ سب سے پہلے نظام کی جگہ شخصی حکومت (ملوکیت) نے لی اور اس کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں شخصیت پرستی در آئی ـــ نظام کی عدم موجودگی کا لازمی نتیجہ شخصیت پرستی ہوتا ہے۔ نظام میں جملہ امور کے فیصلے مرکزِ ملت کی طرف سے کئے جاتے اور حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ نظام کے

نہ رہنے سے زندگی میں ثنویت (DAULISM) پیدا ہوگئی۔ "دنیاوی امور" (پبلک لاز) حکومت نے سنبھال لئے اور "مذہبی امور" (پرسنل یعنی شخصی لاز) علماء کے سپرد کرائے گئے۔ علماء میں سے ایک گروہ نے ائمہ محدثین (امام بخاریؒ۔ امام مسلمؒ وغیرہ) کو اتھارٹی بنا لیا اور دوسرے گروہ نے ائمہ فقہ (امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ امام حنبلؒ) کو اپنا مطاع۔ جب معیار شخصیتیں ٹھہریں، تو پھر ان کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔ جس نے کسی شخصیت کو پسند کیا، اسے اپنا امام تسلیم کرلیا۔ (واضح رہے کہ میں یہاں شیعہ حضرات کے ائمہ کا ذکر نہیں کررہا) یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک مسلسل اور متواتر چلا آرہا ہے۔ اس تمام دوران میں اسلام بحیثیت نظامِ خداوندی کہیں قائم نہیں ہوا۔ مسلمان اس زمانۂ قبل از اسلام کی روش پر گامزن چلے آئے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا۔ شریعت کا کوئی مسئلہ ہو اس کی سند کسی نہ کسی شخصیت پر جاکر رک جاتی ہے۔ نظام میں اس کی سند کتاب اللہ (القرآن) ہوتی ہے۔ اس کو قرآنِ حکیم نے کفر و ایمان کا معیار قرار دیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

(۵/۴۴)

اس کا واضح ارشاد اور حتمی فیصلہ ہے۔ یعنی "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے (معاملات کے فیصلے اللہ کی کتاب کی رُو سے نہیں کرتے) وہی کافر ہیں"۔ ہم اس آیت کو جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں اور بس۔

شخصیت پرستی کا اجراء

ہم نے جب شخصیت پرستی کا اجرا (یا احیا) کیا تو مامورین من اللہ کا تصور بھی ہمارے تحت الشعور میں کروٹیں لینے لگا۔ (یاد رہے کہ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ امت کی ہدایت کے لئے اب کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ معاملات کے فیصلے نظامِ خداوندی کی رُو سے کرنے ہوں گے)۔ ہم نے کیا یہ کہ ہر صدی پر (مامور من اللہ) مجدد کا عقیدہ وضع کرلیا۔ وحی کے قائم مقام، کشف اور الہام کا نظریہ مستعار لیا۔ آخری زمانے میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول اور امام مہدی کی آمد کا عقیدہ وضع کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے ہاں یہ تمام عقائد بھی مسلّم ہیں اور ختمِ نبوت پر ایمان بھی اپنی جگہ قائم!

یہ تمام خلفشار کس بات کا نتیجہ ہے؟ نظام کے باقی نہ رہنے کا! ہمارے ہاں آجکل اسلامی نظام کا بڑا چرچا ہے اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس میں پیش پیش ہیں۔ اس نظام کے داعی کون لوگ ہیں؟ وہی علماء جو شخصیتوں کو اسلام میں سند اور حجت تسلیم کرتے ہیں اور اپنے اس عقیدہ میں ذرا سی ترمیم بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ ان (علماء) کے تصور

کے اسلامی نظام میں:-

(۱) پرسنل لاز (شخصی یا مذہبی قوانین) ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔

(۲) پبلک لاز (دنیاوی امور) "قرآن وسنت" کے مطابق وضع ہوں گے۔

یہ ہے ڈاکٹر اسرار احمد کا اسلام۔ یہ ہے ہمارا موجودہ اسلام۔ آپ سوچئے کہ کیا یہ وہی مُنزّل اللہ دین ہے جسے رسولؐ اللہ نے قائم فرمایا تھا اور جو آپؐ کے بعد، خلفائے راشدینؓ کے عہد میں آگے چلا؟ ہرگز نہیں۔ یہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے جس کا جال ہم پر اس وسعت اور گہرائی سے چھایا ہوا ہے کہ ہم اس کے پھندے سے آسانی سے نکل ہی نہیں سکتے۔ اس پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے قرآنی طریقہ۔ وہی طریقہ جو رسولؐ اللہ نے اختیار کیا۔ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص (۳/۱۰۲)۔ "تم سب کے سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر، اس نظام کے ساتھ، محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کومت آنے دو (کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۱-۳۰/۳۲) اور پارٹی بازی، اللہ کا عذاب (۶/۶۵)۔" یہ ہے اسلامی نظام کے قائم کرنے کا طریقہ۔ کیا ڈاکٹر صاحب غور فرمائیں گے؟

اسلامی نظام کیسے قائم ہوگا؟

یاد رکھیئے! اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہوگا جب:-

۱- سب مسلمان ایک امت کے افراد ہیں۔ ان میں نہ مذہبی فرقے ہوں، نہ سیاسی پارٹیاں۔ (فرقے اور سیاسی پارٹیاں مذہب میں ہوتی ہیں، دین میں نہیں)۔

۲- ساری قوم پر ایک ضابطۂ قوانین لاگو۔ اس میں نہ شخصی قوانین اور پبلک لاز کی تفریق ہو، نہ کسی خاص فقہ کا کا عمل دخل۔ یہ ضابطۂ قوانین اللہ کی کتاب پر مبنی ہو اور ان قوانین پر عمل درآمد کے طریق اُمت کے باہمی مشورے سے طے پائیں۔ یعنی وہی طریقہ جو رسولؐ اللہ نے اختیار کیا تھا (۳/۱۵۸)۔

اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ہم اسلام پر نہیں، زمانہ قبل از اسلام کی روش پر گامزن ہوں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس سختی سے منع کیا تھا۔ (۳/۱۴۳)

ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت قرآنی احکام و قوانین کے مطابق چلائے۔ چنانچہ اس طرز کی خلافت کی بنیاد بھی قرآن حکیم پر اُٹھے گی، اس لئے یہ "خلافت راشدہ کے نظامِ حکومت کی ہو بہو چربہ یا کاربن کاپی ہوگی۔" ڈاکٹر صاحب اپنا مغالطہ دُور کرلیں!

اب آیئے ڈاکٹر صاحب کے دوسرے "مغالطے" کی طرف۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا دوسرا "مغالطہ"

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان قوم کو دوسرا "مغالطہ" اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کے وجود کے بارے میں ہے۔ (یاد رہے کہ ڈاکٹر صاحب "تنظیم اسلامی پاکستان" کے امیر ہیں جس کے منشور میں پاکستان کے موجودہ سیاسی نظام کو ایک انقلاب کے ذریعے بدلنا شامل ہے)۔ اس "مغالطے" کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے انکشاف کیا کہ "خلافت راشدہؓ" کے دور میں بھی سیاسی پارٹیاں موجود تھیں"۔

فرماتے ہیں کہ :-

" اگرچہ ابتدا میں وہ خالص قبائلی بنیاد پر قائم تھیں، جیسے مہاجرین و انصار وغیرہ......
تاہم کچھ ہی عرصے بعد ان میں شخصیات کا عمل دخل نمایاں ہو گیا تھا۔ چنانچہ شیعانِ علیؓ اور
شیعانِ عثمانؓ دو پارٹیاں وجود میں آگئیں......"

ڈاکٹر صاحب یہ ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل فرما رہے ہیں کہ اگر سیاسی پارٹیاں خلافتِ راشدہ کے دور میں تھیں، تو ہمارے زمانے میں کیوں نہیں ہو سکتیں۔ غور فرمایا آپ نے ڈاکٹر صاحب نے کس بے خوفی سے ان حضرات پر سیاست بازی کا لیبل چسپاں کر دیا ہے جن کے بارے میں ربّ العزت نے خود شہادت دی ہے کہ ان کی ساری زندگی قوانینِ خداوندی کے مطابق تھی!

اللہ تعالیٰ نے ان "السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کو، جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بلاشک و شبہ شامل ہیں، "اَلْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" (۸/۴) اور "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" (۹/۱۰۰) کے خطابات سے نوازا ہے، اُن پر ڈاکٹر صاحب اپنی مطلب براری کے لئے، کیچڑ اچھال رہے ہیں! قرآنِ حکیم تو تفرقہ بازی کو شرک (۳۰/ ۳۱-۳۲) اور پارٹی بازی کو اللہ کا عذاب قرار دیتا ہے (۶/۶۵) اور ڈاکٹر صاحب ان مقدس ہستیوں کو اس "شرک" میں ملوث کر کے، اپنی پارٹی (تنظیم اسلامی) اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے قیام کے لئے جواز پیدا کر رہے ہیں! ڈاکٹر صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ ان کا ایسا کہنے سے اللہ کے دین پہ کیا گزرتی ہے، انہیں تو اپنے مطلب سے کام ہے۔ اپنے مطلب کے لئے اگر قرآنِ حکیم کے واضح احکام کی دھجیاں بھی بکھرنی پڑیں، تو ہمارے "عالمِ دین" یہ بھی کر گزرتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال آپ کے سامنے ہے۔

بقول علامہ اقبالؒ ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!

سُن رکھئے! اور ساری دنیا سُن لے کہ انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے اس کی نجات و سعادت کی ایک ہی راہ ہے یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدیؐ (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جس کی طرف پیامِ محمدیؐ (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے۔ ع

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

طلوعِ اسلام

ایک ماہنامہ ہی نہیں، ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے

جس کا مقصد فکرِ قرآنی کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوان طبقہ کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے صحیح آسمانی انقلاب بن کر اُبھرے۔ اس سلسلہ میں اس تحریک کے سالانہ اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں جن میں اہلِ علم، نہایت شگفتہ و شاداب انداز میں، حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتے اور پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ قرآنی روشنی میں کرتے ہیں۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ

حرام کی کمائی

(جس کے آجکل پھاٹک کھل گئے ہیں)

ایک مسلمان کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو۔ اس کے اخلاق بھی خراب ہوں۔ وہ احکامِ شریعت کی اطاعت بھی نہ کرتا ہو۔ وہ نماز روزے کا بھی پابند نہ ہو۔ وہ فاسق و فاجر ہو۔ حتیٰ کہ وہ زانی اور شرابی بھی کیوں نہ ہو۔ ایک بات ایسی ہے جس کا وہ نہایت سختی سے پابند ہوگا۔ وہ یہ کہ وہ سؤر (کے گوشت) کو حرام سمجھے گا۔ وہ اسے کبھی نہیں کھائے گا۔ اس پر ہزار سختی کی جائے یا کتنا ہی بڑا لالچ کیوں نہ دیا جائے، وہ اس کے قریب تک نہ جائے گا۔ سؤر کے گوشت کا کھانا تو ایک طرف، وہ اس کا نام تک سننا گوارا نہیں کرے گا۔ اس کے تصوّر سے اسے جھرجھری آجائے گی۔ اگر اسے کہا جائے کہ تم نے فلاں بدمعاملگی کی ہے تو وہ (اپنی صفائی میں) بلاساختہ کہے گا کہ میرے لئے تو ایک پیسہ بھی سؤر کے برابر ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سؤر کے متعلق ہمارا ردِّعمل یہ ہے، کیا ناجائز کمائی کے متعلق بھی ہمارا ردِّعمل اس قسم کا ہے؟ بالکل نہیں۔ قطعاً نہیں۔ حالانکہ جس خدا نے سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اس نے ناجائز کمائی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ تو کیا یہ امر موجبِ حیرت نہیں کہ ایک حرام کے متعلق تو اس قدر شدید ردِّعمل اور دوسرے حرام کے خلاف ردِّعمل تو کجا، اس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا؟ سؤر کا گوشت تو ایک طرف رہا۔ اگر کسی ہوٹل کے متعلق شبہ ہو جائے کہ اس میں کباب، سؤر کی چربی میں تلے جاتے ہیں، تو اس ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ لیکن وہی لوگ ساری ناجائز کمائی سے اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور انہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم حرام کھا رہے ہیں۔ ناجائز کمائی میں بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں حکومت کا مروّجہ قانون جرائم قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی کمائی کے متعلق یہ تو کہا جائے گا کہ ایسا کرنا جرم ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایسا کرنا "حرام" (یا گناہ) ہے ——— اور اگر معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں تو اس کمائی کے جرم ہونے کا احساس بھی مٹ جائے گا۔ ناجائز کمائی کی بعض صورتیں ایسی ہوں گی جنہیں مروّجہ قانونِ حکومت جرم قرار نہیں دیتا۔ اس سے اجتناب برتنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

---

* ہمیں معلوم ہے کہ بعض ممالک کے مسلمان اس معاملہ میں ایسے متشدد نہیں رہے۔ ہمیں ان سے سروکار نہیں۔ پاکستان میں ہنوز ویسی صورت پیدا نہیں ہوئی اور ہمارے اس وقت کے مخاطب یہی اہلِ پاکستان ہیں۔

لیکن جس خدا پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس نے حرام اور حلال اور جائز و ناجائز کا معیار کچھ اور بتایا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ وہ معیار کیا ہے۔

باطل کی کمائی

قرآنِ مجید کی دو اصطلاحیں بڑی بنیادی ہیں۔ یعنی حق اور باطل۔ قرآنِ کریم آمدنی کے جن ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے، وہ آمدنی حق کے مطابق اور حلال ہے۔ جن ذرائع کو وہ ناجائز ٹھہراتا ہے، وہ آمدنی باطل اور حرام ہے۔ حرام اور حلال کا یہ بنیادی معیار ہے۔

قرآن مجید سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷-۱۸۳ میں روزوں کے احکام ہیں۔ روزہ کے معنے یہ ہیں کہ ایک مسلمان روزہ کی حالت میں خدا کے حکم کے مطابق ان چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام قرار دے لیتا ہے جنہیں خدا نے عام حالات میں حلال قرار دیا ہے۔ وہ خدا کے اس حکم کی اس شدت سے پابندی کرتا ہے کہ سخت سے سخت گرمی میں انتہائی پیاس کی حالت میں۔ کمرے کے اندر تنہا بیٹھے ہوئے جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہیں ٹپکاتا۔ لیکن روزوں کے احکام کے بالکل ملحق آیت (۲/۱۸۸) میں اسی خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ :-

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ - (۲/۱۸۸)

ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے نہ کھاؤ۔

"لیے روزہ" تو ایک طرف، وہ روزہ دار جو مرتا مر جائے گا لیکن پانی کا ایک گھونٹ نہیں پیئے گا، باطل کی کمائی کے متعلق خدا کے اس حکم کی کچھ پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ روزہ کی حالت میں بھی ایسی کمائی کرنے میں مصروف رہے گا! ہمارے ہاں روزوں کے احکام کو آیت (۲/۱۸۷) تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ان آیات میں آیت (۲/۱۸۸) کو شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن روزہ میں بھی تو مسلمانوں کو اس امر کی مشق کرائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کو چھوڑنے کا خدا حکم دے، وہ انہیں بلا تامل چھوڑ دے، خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن ہماری یہ پابندی صرف کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رہتی ہے۔ ناجائز کمائی کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ بالکل اسی طرح، جیسے سؤر کھانے کو تو حرام سمجھا جاتا ہے لیکن ناجائز کمائی کو حرام نہیں سمجھا جاتا۔

قرآنِ کریم بنی اسرائیل (یہودیوں) کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بتاتا ہے کہ: أَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ - (۲/۱۶۱) "وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے تھے۔" اس کے آگے ہے —— وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا عَظِيمًا - (۲/۱۶۱) ان میں سے جو اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے، وہ کافر تھے اور ان کے لئے سخت عذاب کی وعید کی گئی تھی" —— اس سے ظاہر ہے کہ ناجائز کمائی کرنا، کفر کے مرادف اور عذابِ جہنم کا موجب ہے —— سوچئے کہ اس ناجائز کمائی کے خلاف اس سے زیادہ واضح اور سخت تہدید اور کیا ہو سکتی ہے!

باطل (ناجائز) کمائی کے بہت سے گوشے ہیں مثلاً، دغا فریب۔ رشوت۔ چوری۔ خیانت۔ دھاندلی۔

گراں فروشی۔ چور بازاری۔ وغیرہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے گوشے کا ذکر خاص طور پر کیا ہے جس کی طرف عام طور پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ اس نے کہا ہے۔

احبار و رہبان

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! (یاد رکھو) علما، اور مشائخ میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف جانے والی راہ سے روکتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یعنی (وہ) روپیہ لے کر احکامِ شرعیہ اور اخبارِ الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں۔ ادھر عوام الناس نے انہیں، جیسے پہلے گذرا، خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہی ان کے نزدیک حجت ہے۔ اس طرح علماء و مشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے، اور اپنی سیادت و ریاست قائم رکھنے کے لئے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں۔ کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دینِ حق اختیار کر لیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے۔

(حاشیہ شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ۔ ص ۲۴۸)

—— (۰) ——

خبیث اور طیّب

جائز اور ناجائز کمائی کے سلسلہ میں، قرآن مجید میں اور اصطلاحات بھی آئی ہیں۔ مثلاً ــــ طیب اور خبیث ــــ حق و باطل کی طرح یہ اصطلاحات بھی بڑی جامع ہیں لیکن موضوع زیرِ نظر کی رو سے، ان کا مفہوم بھی جائز اور ناجائز لیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا ایک مقصد جلیلہ یہ بتایا ہے کہ:۔

وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ (۷/۱۵۷)

وہ لوگوں کے لئے طیّبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دے گا۔

قرآن کریم کے اس واضح ارشاد کے مطابق، جائز کمائی طیّب یعنی حلال ہے اور ناجائز کمائی خبیث یعنی حرام۔ یعنی لفظ (حرام) لحمِ خنزیر (سؤر کے گوشت) کے متعلق آیا ہے۔ (۵/۳) لہٰذا ایک مسلمان کے لئے سؤر اور ناجائز کمائی میں ذرا بھی فرق نہیں۔ دونوں یکساں حرام ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ: لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ۔ (۵/۱۰۰) "چونکہ ناجائز طریق سے انسان چند دنوں میں لاکھوں پتی

ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص لپک کر اس کی طرف جاتا ہے۔ لیکن (مسلمانو! تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ) جائز، اور ناجائز کمائی کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی، اسی طرح جیسے حلال اور حرام ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔
قرآنِ مجید نے خبیث وطیب (جائز اور ناجائز) کی کئی مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے کہ:

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا۔ (۴/۲)

اور یتیموں کو ان کا مال اسباب ٹھیک ٹھیک دیا کرو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی طیب چیزوں کو رکھ لو اور ان کے بدلے اپنی خبیث چیزیں انہیں دیدو۔ نہ ہی ان کے مال اور اپنے مال کو ملا کر گڈمڈ کرو۔ یاد رکھو! ایسا کرنا سخت بے انصافی کی بات اور وبالِ عظیم کا باعث ہے۔

"یتیم" سے بالعموم وہ بچے مراد ہوتے ہیں جن کا باپ فوت ہو جائے۔ یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اس کے بنیادی معنیٰ ہر وہ شخص ہے جو معاشرہ میں تنہا، بے یار و مددگار رہ جائے۔ مندرجہ بالا حکم میں اس قسم کے تمام افراد شامل ہیں۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "ان احکام میں بیٹوں کے حکم کو شاید اس لئے مقدم بیان فرمایا کہ یتیم بے سروسامانی اور مجبوری اور بے چارگی اور بے کسی کے باعث، رعایت اور حفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے۔" (ایضاً ص۹۹) اس سے واضح ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں بے سروسامان۔ کمزور۔ مجبور۔ بے چارہ اور بے کس ہوں۔ ان کی بے کسی اور بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ حاصل کرنا، خبیث (حرام) ہے۔ آگے چل کر کہا کہ اس طرح حاصل کردہ مال کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ لوگ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔ (۴/۱۰) بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اکثر و بیشتر حالات میں ناجائز کمائی، دوسروں کی مجبوری، بے چارگی، بیکسی اور بےبسی سے فائدہ اٹھا کر حاصل کی جاتی ہے۔ ایسی کمائی قطعاً حرام ہے۔

رشوت

آجکل حرام کمائی میں رشوت کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اس کا چلن ایسا عام ہو گیا ہے کہ آپ نے اچھے اچھے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ کیا کیا جائے آجکل رشوت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ روزوں کے احکام کے تسلسل میں ایک آیت (۲/۱۸۸) کا ایک حصہ پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:-

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۱۸۸)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ نہ ہی اسے بطور رشوت حکام تک

اس مقصد کے لئے پہنچاؤ کہ کسی دوسرے کے مال میں سے تمہیں وہ مل جائے جس کے متعلق تم جانتے ہو کہ تم اس کے حق دار نہیں ہو۔

کس قدر صاف اور واضح ہے یہ حکمِ خداوندی۔ آج کون نہیں جانتا کہ رشوت حرام ہے لیکن اس کے باوجود جانتے بوجھتے اس کا چلن عام ہو رہا ہے۔ حیرت ہے کہ سؤر کو حرام سمجھ کر اس سے مجتنب رہنے والے، رشوت کا مال کس طرح بلا غلّ و غش ہڑپ کرتے رہتے ہیں!۔

—(۰)—

کاروباری دُنیا

رشوت کا تعلق تو پھر بھی ایک مخصوص حلقہ سے ہے۔ یعنی ان لوگوں سے جنہیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا کچھ اختیار اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس راستے سے حرام کی کمائی سیلاب کی طرح اُمڈ کر آتی ہے وہ کاروبار کا میدان ہے۔ "کاروبار" میں تجارت، لین دین، خرید و فروخت بھی شامل ہے اور ملیں اور فیکٹریاں بھی جن میں محنت کشوں اور کارخانہ داروں کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اس میدان میں ناجائز کمائی کے بے تحاشا امکانات کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے مختلف انداز سے احکامات دیئے ہیں۔ سب سے پہلے عام تجارت کو لیجئے۔ فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ (۴/۲۹)

اے جماعتِ مومنین! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ معاشرتی زندگی میں روزمرّہ کی اشیائے ضروریہ کی خرید و فروخت ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے جائز طریق یہ ہے کہ خریدار دکاندار کی منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور نہ ہو۔ بلکہ یہ گاہک اور دکاندار کی باہمی رضامندی سے ہو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہ دوسروں کو قتل کر دینے کے مترادف ہو گا۔ خدا تمہیں ازراہِ ترحّم قتل و غارت گری سے بچانا چاہتا ہے۔

اس آیۂ جلیلہ میں خرید و فروخت کا ایک ایسا عظیم اصول بیان کیا گیا ہے جس سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور وہ ہے "باہمی رضامندی سے تجارت" اس سلسلہ میں جو کچھ آجکل ہو رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالیئے۔ دکاندار (خواہ وہ تھوک فروش ہوں یا خوردہ فروش) ایک تنظیم قائم کر لیتے ہیں جس کی رُو سے وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے داموں میں بیچی جائے گی۔ صاحبِ ضرورت، بازار (یا منڈی) میں پہنچتا ہے۔ دوکاندار اسے مطلوبہ چیز کی قیمت بتاتا ہے۔ خریدار دیکھتا ہے کہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ وہ کچھ کم کرنے کو کہتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ "میں تو اتنے ہی میں دوں گا۔ آپ کو کہیں اور سے سستی ملتی ہے تو وہاں سے لے لیجئے"۔ خریدار مختلف دکانوں سے دریافت کرتا ہے تو اُسے وہی قیمت بتائی جاتی ہے۔ فرمایئے کہ وہ،

اس کے بعد کیا کرے؟ اسے اس چیز کی ضرورت ہے اس لئے وہ آپ سے انہی داموں خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دکانداروں سے پوچھئے تو وہ نہایت دھڑلّے سے کہتے ہیں کہ صاحب! ہم کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ چوری نہیں کرتے۔ ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ گاہک کو قیمت بتاتے ہیں اور اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اسے خریدے یا نہ خریدے۔ یہ قرآنِ مجید کے ارشاد کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اس نے " تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ " کو حلال قرار دیا ہے۔

اس جواب میں اس کے سوا کیا کہا جائے جو اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ (۲/۲۶) " اسی قرآن سے اکثر لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور اسی سے اکثر صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں "۔ جس قسم کی تجارت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (اور جسے آجکل قطعاً ناجائز یا معیوب نہیں سمجھا جاتا) اسے قرآن کے حکم کے مطابق قرار دینا، ضلالت (خود فریبی) نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر یہ دکاندار (مثلاً) سبزی فروش ہے تو اس سے پوچھئے کہ جب تم قصاب سے گوشت خریدتے ہو اور وہ ایسا نرخ بتاتا ہے کہ جسے تم نامناسب سمجھتے ہو، لیکن اس کے باوجود تم اس نرخ پر گوشت خریدنے پر مجبور ہوتے ہو، تو کیا تم اسے باہمی رضامندی سے تجارت " قرار دیتے ہو! قصاب کی روش کو تو تم ظلم و زیادتی سمجھتے ہو اور اس کے خلاف واویلا مچاتے ہو لیکن اپنی اسی قسم کی روش کو بالکل جائز قرار دیتے ہو!

قرآنِ کریم نے اس قسم کی تجارت کو کاروبار نہیں بلکہ قتل و غارت گری قرار دیا ہے (وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ)۔ اور جیسا کہ معلوم ہے قتل، عدالتِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اسی لئے اگلی آیت میں ہے:۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ (۴/۳۰)

خدا نے بات واضح طور پر سمجھا دی ہے۔ اگر تم اس کے بعد بھی ایسا ہی کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیدہ و دانستہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتے اور ظلم اور زیادتی کرتے ہو۔ اس کی سزا جہنم ہے۔ عدالتِ خداوندی سے اس قسم کی سزا کا ملنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

چونکہ اس قسم کی تجارت میں، اشیائے ضروریہ کے تیار کرنے یا پیدا کرنے والے، تھوک فروش اور خوردہ فروش سب شامل ہوتے ہیں، اس لئے تجارتِ عادلہ ایک خاص نظام کے تحت ہی عمل میں آسکتی ہے۔ یعنی ایسا انتظام جس کی رو سے، ہر شے کا ہر اسٹیج پر منافع مقرر ہو اور اس کے بعد اس کا انتظام ہو کہ ہر ضرورت مند کو مقررہ قیمت پر مطلوبہ چیز مل جائے۔ اسے کہا جائے گا۔ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ یہی منافع حلال ہوگا۔

ربٰوا

قرآنِ کریم نے بیع کو حلال اور ربٰوا کو حرام قرار دیا ہے۔ (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵))

ربوٰ کی بحث تفصیل طلب ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ (میں اس کے متعلق تفصیل سے بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس وقت میں ربوٰ (سود) کی اس ابتدائی شکل کو لیتا ہوں جس میں ایک ضرورت مند، قرض دینے والے کو سود (یا بیاج) دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر، قرض خواہ جو کچھ وصول کرتا ہے، قرآن مجید اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس روش سے باز آجاؤ تو صرف اپنا اصل زر وصول کر سکتے ہو۔ اس سے لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲/۲۷۹) نہ تم پر ظلم و زیادتی ہوگی کہ تمہارا اصل تمہیں مل جائے گا۔ اور نہ ہی مقروض پر کوئی زیادتی کہ اسے اپنی مجبوری کے ماتحت زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔

قرآنِ کریم کے اس اصول کے مطابق دیکھئے کہ اس نے جو بیع کو حلال کیا ہے اور ربوٰ کو حرام، تو اس میں بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ جو کچھ کسی سے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر وصول کیا جائے وہ حرام ہے۔ اگر بیع میں بھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بیع، بیع نہیں رہتی، ربوٰ ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تو مروجہ معاشیات میں پوری کی پوری تجارت، ربوٰ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور ایک تجارت پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج زندگی کا کونسا معاملہ ہے جس میں دوسرے کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جاتا؟

میزان

قرآنِ کریم نے میزان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بنیادی طور پر اس نے کہا ہے کہ کارگہِ کائنات میزان کے سہارے چل رہا ہے۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ۔ (۵۵/۷) خدا نے ایسے قوانین وضع کر دیئے ہیں جن کی رو سے آسمانی کرّوں میں باہمی توازن قائم رہتا ہے۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ۔ (۵۵/۸-۹) اس لئے تم بھی اپنے معاشرہ میں عدل و انصاف کے ساتھ توازن قائم رکھو۔ اور کسی کے حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔

انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے جو نظام قائم کیا جائے گا اس میں احکامِ خداوندی کے ساتھ میزان کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ (۵۷/۲۵ ز ۴۲/۱۷)۔ اور قیامت میں اعمالِ انسان کے "تولنے" کے لئے بھی میزان کھڑی کی جائے گی۔ (۲۱/۴۷) اس میزان کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ: فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۴۷)۔ "تاکہ کسی شخص پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو"۔ یہ ہے میزان کا بنیادی مقصد۔

میزان کے اس بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر، آپ کاروباری دنیا کی طرف آیئے۔ اس میں عام حکم تو یہ دیا گیا ہے کہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۳ ، ۱۷/۳۵)۔ خرید و فروخت کی دنیا میں تو اس حکم سے عام مراد یہی ہوگی کہ ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے

یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جو کچھ کسی سے لو، یہ دیکھو کہ اُسے اس کی قیمت کے مطابق چیز ملتی ہے۔ بظاہر ہے کہ ماپ اور تول صحیح رکھنا تو ہر دکاندار کا انفرادی عمل ہوگا لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ گاہک کو اس کی ادا کردہ رقم کے مطابق چیز مل رہی ہے یا نہیں، کسی نظام کے تابع ہوگا۔ یعنی اشیاء صرف کی قیمتیں مقرر کرنا اس نظام کا فریضہ ہوگا۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہوگی کہ خریدار کو آمیزش کے بغیر مطلوبہ چیز ملے۔ یہ نہ ہو کہ قیمت تو دودھ کی ادا کرے اور ملے اُسے "دودھیا پانی" (MILKY WATER) یا کپڑے کے ہر گز پر لکھا ہوا تو ہو (PURE WOOL) اور ہو اس میں (NYLON) کا مکسچر اس قسم کی تجارت بھی حرام ہو گی۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ جس قوم کے کاروبار میں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو جائیں، وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں۔ اسی کی شہادت میں اس نے قوم شعیبؑ کی عبرت آموز داستان بیان کی ہے۔ حضرت شعیبؑ ان سے بار بار کہتے تھے کہ: فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (۷/۸۵) "تم ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو، اور جو کچھ کسی سے لو اس کے مطابق اُسے چیز دو۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ ایسا کرنا ملک میں فساد برپا کرنے کے مرادف ہوگا۔ جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ (نیز ۱۱/۸۴-۸۵، ۲۶/۱۸۱)۔ اس سے واضح ہے کہ خرید و فروخت کے غلط نظام کا نتیجہ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہوتا ہے۔

(۰)

محنت کا معاوضہ

قرآن کریم کی رُو سے سب سے اہم سوال محنت کش کی محنت کے معاوضہ کا ہے۔ اگر اس کو محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیا جائے تو جو کچھ اس میں سے غصب کر لیا جائے، وہ حلال نہیں ہوگا، حرام ہو جائے گا۔ اس نے صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے کہ فرعون دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اس کے مستبد اور ظالمہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کریں۔ لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ۔ (۲۰/۱۵) "تاکہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔" فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲) اور کسی کو اس کا خطرہ نہ رہے کہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوگی۔ اور اس کی محنت کے معاوضہ کو ہضم کر لیا جائے گا۔

نظامِ سرمایہ داری میں یہ ناممکن ہے کہ محنت کش (مستاجر) کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جا سکے۔ اس میں محنت کشوں کو اُجرت (WAGES) پر ملازم رکھا جاتا ہے، مستاجر (مزدور) اپنی اُجرت مقرر نہیں کرتا۔ اسے آجر (ملازم رکھنے والا) مقرر کرتا ہے۔ اس معاملہ کو یہ کہہ کر برحق قرار دے دیا جاتا ہے کہ مزدور اپنی رضامندی سے اُجرت منظور کرتا ہے، اس لئے اس پر کوئی ظلم اور

زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ وہی دلیل ہے جسے ہم تجارت کے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ " خریدار اپنی رضامندی سے قیمت ادا کرتا ہے " واقعہ یہ ہے کہ خریدار ہو یا مزدور، دونوں اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے کی بات مان لیتے ہیں۔ جس مزدور کے گھر میں کھانے کو ہو وہ کبھی آجر کی نامناسب شرائط پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کی معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں جو وہ ہر شرط پر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ " بھا کِن وگاڑیا ــــ رات دیاں بُھکیاں " " رات کو بھوکے سونے والے نرخ بگاڑ دیتے ہیں " قرآن کے معاشی نظام میں اُجرتوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب (اور جہاں) قرآنی نظام رائج ہو۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ مملکت ایسا طریق وضع کرے جس سے محنت کش کی محنت غصب نہ کی جا سکے۔ ہم تو آجر سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مستاجر (مزدور) کی محنت سے جو کچھ غصب کیا جائے وہ رزق حلال نہیں رہتا۔

کام چور

قرآن کریم جہاں آجر کو اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مستاجر کی محنت کو غصب نہ کرے، وہاں وہ مستاجر (مزدور) سے بھی کہتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ لینے کا حقدار ہے۔ اگر محنت کئے بغیر معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ کمائی بھی حلال نہیں ہوگی۔ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۔ ($\frac{۵۳}{۳۹}$) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ " کام چور " کی کمائی، حلال کی کمائی نہیں کہلا سکتی۔

جو کچھ اوپر آجر اور مستاجر کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق ملازمت پیشہ حضرات پر بھی یکساں ہوتا ہے۔ وہ بھی اُجرت ہی پر کام کرتے ہیں جسے تنخواہ کہا جاتا ہے۔

ــــــ (٠) ــــــ

تطفیف

بات چلی تھی ماپ تول کے پیمانوں سے۔ اس ضمن میں آجر اور مستاجر کے معاملہ کا ذکر آگیا۔ قرآن کریم میں ایک سورۃ ہے جس کا عنوان ہے۔ التطفیف۔ تطفیف کے لغوی معنیٰ ہیں پیالہ کو پورا پورا نہ بھرنا۔ اس میں کچھ کمی کر دینا۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں " اونٹنی کے پاؤں اس طرح باندھ دینا کہ وہ پوری رفتار سے نہ چل سکے۔" ایسا کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے اسے قرآن کریم نے خود ہی واضح کر دیا۔ فرمایا۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۔ تطفیف کی ذہنیت اور روش اختیار کرنے والے تباہ ہو جاتے ہیں۔ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۔

وہ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنے واجبات وغیرہ لیتے ہیں تو پورے پورے لیتے ہیں۔ ذرا نہیں چھوڑتے۔ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ۔ (۸۳/۳) "لیکن جب دوسروں کے واجبات اور حقوق دیتے ہیں تو ڈنڈی مار جاتے ہیں"۔ اس آیت میں کالوھم اور وزنوھم کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کو دیتے وقت ماپ اور تول میں کمی کر دیتے ہیں، اور یہ معنی بھی چیزوں ہی کو نہیں۔ جب یہ خود انسانوں کو ماپتے اور تولتے ہیں تو ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق صلہ نہیں دیتے۔ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں کم از کم دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی نمود کر سکیں۔ وہ ان کے "پاؤں باندھ کر" رکھتے ہیں۔ یہ بھی دوسروں کی محنت اور صلاحیتوں کے استحصال (EXPLOITATION) کا ایک طریق ہے جو آجکل کے صنعتی دور کی عام روش ہے۔ اس طریق سے حاصل کردہ دولت بھی رزقِ حرام کے زمرہ میں شامل ہو گی۔

(۰)

خیانت

یہاں تک گفتگو ان معاملات کے بارے میں تھی جن میں دو فریق شامل ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان معاملات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک ہی شخص ملوث ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ: (لَا) تَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ (۸/۲۷) "جو امانتیں تمہارے سپرد کی جائیں ان میں خیانت مت کرو"۔ امانت صرف وہی نہیں جسے ایک شخص کسی دوسرے شخص کے پاس بغرضِ حفاظت رکھ دے۔ اس میں وہ تمام روپیہ یا مال اسباب وغیرہ شامل ہے جو حکومت، یا کوئی ادارہ یا فرم اپنے کسی ذمہ دار افسر کو کسی پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے دیتی ہے۔ یا جو روپیہ پیسہ ویسے ہی اس کی تحویل میں رہتا ہے۔ جیسے خزانچی یا بینک کے افسر۔ اس روپیہ میں کسی قسم کی بددیانتی، خیانت ہے اور بدترین جرم۔ اس قسم کی کمائی یکسر حرام ہے۔

(۰)

حلال و طیب

رزق حلال و حرام کے سلسلہ میں قرآن کریم بہت دور تک جاتا ہے۔ اس نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ: وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ (۵/۸۸) "جو حلال رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے کہ اسے طیب طریق سے کھاؤ اور اس طرح اس خدا کے حکم کی نگہداشت کرو جس پر تم ایمان لانے مدعی ہو"۔ "رزق حلال کو طیب طور پر کھاؤ"۔۔۔ یہ نکتہ غور طلب ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ بکرا حلال جانور ہے،

لیکن اگر اسے خدا کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے تو اس کا گوشت حلال نہیں رہتا حرام ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں اور ہم اس کی بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کا بکرا چرا کر اسے صحیح طریق سے ذبح کر لیا جائے تو کیا وہ حلال رہے گا؟ قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ وہ حلال نہیں رہے گا۔ کیونکہ ناجائز طریق سے حاصل کئے جانے کی وجہ سے وہ طیب نہیں رہا۔ لہٰذا جو چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے حلال ہیں اگر انہیں ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے تو وہ طیب نہیں رہتیں، اس لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ حلال کے لئے طیب ہونا شرط ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۔ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (۵/۴) ”اے رسول! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے کیا کچھ حلال قرار دیا ہے، ان سے کہو کہ اس نے طیبات کو حلال قرار دیا ہے۔ یعنی ان حلال چیزوں کو جو ناجائز طریق سے حاصل کی گئی ہوں۔

”حلال اور طیب“ کی جامعیت کے طور پر قرآن مجید میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (۲/۱۶۸) ”اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال ہے اسے طیب طریق سے کھاؤ۔ اسے غیر طیب طریق سے کھانے سے تم شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرو گے۔ یاد رکھو! شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے“۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ناجائز طریق سے حاصل کردہ دولت سے جو کچھ بھی تم خریدو گے، وہ اگر اپنی اصل کے اعتبار سے حلال بھی ہو تو بھی حرام ہو جائے گا۔ حلال وہی چیزیں ہوں گی جنہیں حلال کی کمائی سے حاصل کیا جائے۔ اسی کو قرآن مجید نے رزقِ کریم (۸/۴؛ ۲۲/۵۰) کہا ہے۔ یعنی ”عزت کی روٹی“ اس کی وضاحت کرتے ہوئے دوسری جگہ کہا

عزت کی روٹی

کہ خبیث (ناجائز کمائی سے حاصل کردہ) چیزیں کھانے والے خود خبیث ہوتے ہیں اور طیب چیزیں کھانے والے طیب۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۴/۲۶)۔ یہی (طیب لوگ) ہیں جو تباہی سے محفوظ رہتے ہیں، اور جنہیں عزت کی روٹی ملتی ہے۔

(۰)

تکاثر

ان تصریحات کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ لوگ ناجائز طریقے اسی لئے اختیار کرتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ دولت سمیٹنے کی دوڑ (RACE) میں ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں۔ اسے عربی زبان میں ”تکاثر“ کہتے ہیں جو قرآن کریم کی ایک سورۃ کا عنوان ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ: اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (۱۰۲/۱-۲) ”دولت سمیٹنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح مقاصد کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔

اور یہ دوڑ کہیں ختم نہیں ہوتی۔ یہ قبر تک چلی جاتی ہے۔ ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے لیکن جب جذبہ محض دولت سمیٹنا ہو اور اس میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس، تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ یہ وہ پاگل پن ہے جس میں جائز اور ناجائز کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ایسے لوگوں کا مقصدِ حیات جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲) رہ جاتا ہے۔ یعنی " دولت جمع کرتے چلے جانا اور پھر اُسے گنتے رہنا"۔ بس یہ ہوتی ہے ان کی زندگی! یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) ایسا انسان اس خیالِ خام میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا۔ کَلَّا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ مال و دولت اُسے جہنم رسید کر کے ریزہ ریزہ کر دے گا۔ (۱۰۴/۴-۹) ناجائز کمائی سے جمع کردہ مال و دولت انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (۹۲/۱۱) جب تباہی اس کے سامنے آئے گی تو وہ کہے گا کہ میں اپنی دولت کو بڑی قوت کا باعث سمجھتا تھا لیکن هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۶۹/۲۹) قوت کا یہی زعمِ باطل مجھے لے ڈوبا اور کوئی یار و مددگار میرے کام نہ آیا (۶۹/۳۵)۔

انسان اکثر و بیشتر اولاد کی خاطر کمائی کے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸)۔ یاد رکھو! اس طرح حاصل کردہ مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ اس سے بچو۔

(۰)

حلال اور حرام کمائی کے ضمن میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ رزق حلال وہ ہے جو ان طریقوں سے حاصل کیا جائے جنہیں قرآنِ کریم جائز قرار دیتا ہے۔ اسے وہ حق کہہ کر پکارتا ہے۔ اور رزقِ حرام وہ ہے جو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے۔ اسے وہ باطل کہتا ہے۔ حق و باطل (حرام اور حلال) کے متعلق اس کا فیصلہ یہ ہے کہ:-

وَیَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۲/۲۴)

خدا کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ حق باقی رہتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ باطل کے جواز میں تم کتنے ہی عذر پیش کرو، وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خدا تمہارے دل میں چھپے ہوئے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

لہٰذا، خدا پر ایمان رکھنے والے، ناجائز کمائی کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی بحثیں تو عام ہوتی ہیں کہ کوّا حلال ہے یا حرام۔ اے کاش! اس قسم کی بحثوں میں اُلجھنے والے مسلمانوں کو یہ بھی بتاتے کہ ناجائز کمائی سے حلال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا حرام جس طرح سؤر کا گوشت حرام ہے۔ جس دن یہ حقیقت ہمارا جزوِ ایمان بن گئی، معاشرہ سے (CORRUPTION) اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے سوا اصلاحِ معاشرہ کی کوئی

صورت نہیں۔

(٠)

ایک کہانی

رزقِ حلال سے، معاشرہ کی خرابیوں ہی کا استیصال نہیں ہوتا۔ اس سے افراد کے کیریکٹر میں اس قدر پختگی اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے جس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ہمیں بچپن میں ایک کہانی پڑھائی جایا کرتی تھی جو بڑی پُر معنی تھی۔ محمود غزنوی جب ہندوستان پر حملہ کے لئے آیا تو اس کی فوج میں ایک بیوہ کا نوجوان بیٹا بھی سپاہی تھا۔ جب اس کی فوج فاتح و منصور واپس گئی تو وہ بڑھیا اپنے بیٹے کی تلاش میں لشکر میں آئی۔ اس کے بیٹے کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ تمہارا بیٹا تو میدانِ جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کی موت کس طرح واقعہ ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا۔ دشمن کا تیر اس کی پشت میں لگا اور وہ مر گیا۔ اس بڑھیا نے کہا کہ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا ہو لیکن اسے میں کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا تھا اور اس کی پشت میں تیر لگا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سینے پر تیر کھایا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ مائی! تم تو میدانِ جنگ میں تھی نہیں۔ تم یہ بات اس حتم و یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟ اس نے کہا کہ اس لئے کہ میں نے اس کے حلق میں حرام کے دودھ کا ایک قطرہ بھی ٹپکنے نہیں دیا تھا۔ جس بچے کی پرورش رزقِ حلال پر ہوئی ہو، ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔

بات بڑھتے بڑھتے سلطان تک پہنچی۔ اس نے تحقیق کرائی تو بڑھیا کی بات سچ نکلی۔ اس سپاہی نے اپنے سینے پر تیر کھا کر جان دی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے یہ غلط بیانی ہنسی مذاق کے طور کی تھی۔

یہ کہانی تاریخی اعتبار سے کیسی ہی ہو، حقیقت کے اعتبار سے بالکل سچی ہے۔ رزق حلال سے انسان کے اندر، حق گوئی و بیباکی اور جرأت و بسالت کی وہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور جو قوم اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو گی اسے دنیا میں کون شکست دے سکتا ہے؟ اسی حقیقت کے پیشِ نظر تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی!

حرام کی کمائی سے افراد اور قوم میں بلندیوں کی طرف جانے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس فرد یا قوم کو حرام کی کمائی کا چسکا پڑ جائے، وہ محنت کرنے سے جی چراتی

ہے اور جب یہ عادت (یعنی محنت کے بغیر مال و دولت حاصل کرنے کی روش) پختہ ہو جائے تو محنت کرنے کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے باطل (ناجائز) کمائی کو آثم کہہ کر پکارا ہے۔ (۲/۱۸۸) اثم کے معنی ہیں ایسی روش جس سے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جائے اور انسان اپنے ساتھیوں سے پچھڑ کر پیچھے رہ جائے۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے مَیْسِرَۃ کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ (۲/۲۱۹)۔ ہمارے ہاں میسرہ کا عام ترجمہ جوُا کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ جوُا بھی میسرہ میں شامل ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق صرف جوُا پر نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا مادہ یسر ہے اور یسار کے معنی بایاں ہاتھ ہیں۔ جس طرح ہم اپنے ہاں ہر آسان کام کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی طرح ہر وہ کمائی جو محنت اور مشقت کے بغیر (ناجائز طریق سے) بآسانی حاصل ہو جائے وہ میسرہ میں شامل ہو گی۔ ایسی کمائی کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ: فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲/۲۱۹) اس سے دولت تو ضرور اکٹھی ہو جاتی ہے لیکن انسان کے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے اور إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ (۲/۲۱۹) اور قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جانے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اس طرح دولت حاصل ہونے سے ہوتا ہے۔

یہ ہے وجہ جو ناجائز کمائی سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس سے "پرواز میں کوتاہی" واقع ہو جاتی ہے۔ اور جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہو اس سے (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) موت ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔ چوری، فریب دہی، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، جیب تراشی، رشوت ستانی، خیانت، بددیانتی یا شبا شب کروڑ پتی بن جانے کی ہوس۔ یہ سب آثم اور میسرہ (محنت سے جی چرانے) کے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار ہیں اور ان کا علاج رزقِ حلال ہے

گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام! (اقبالؒ)

جو قوم، قرآنِ کریم کے حرام قرار دادہ رزق کو حرام سمجھ لے اس کا نظامِ حیات قیامت تک محکم اور استوار رہے گا۔

(۰)

ڈاکٹر سید عبدالودود

نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ

قسط ۲

(نوٹ:۔ اب ان ارتقائی منازل کا بیان ہو گا جن میں سے گزر کر تخلیق نفسِ واحدہ تک پہنچی۔ یہ منازل حسبِ ذیل ہیں۔ کیمیائی ارتقاء، بے جان مادہ میں زندگی کی نمود اور زندہ خلیوں کی تخلیق، زندہ خلیوں کی خصوصیات اور مورثوں کا فعل، عملِ تولید کا خاکہ، صنف کی حقیقت، کثیر الخلایہ حیوانات کی صنفی تولید۔ یوں تو اصل مسئلہ صرف عملِ تولید کا خاکہ بیان کرنے سے بھی حل ہو سکتا ہے، لیکن تمام ارتقائی مراحل کے بیان سے اس مسئلہ کی جامع اور مربوط شکل سامنے آجائے گی۔ آج کا موضوع کیمیائی ارتقاء ہے جو غیر سائنسدان قارئین کے لئے قدرے خشک ہو گا مشکل نہیں ہو گا لیکن اس کے بعد ہم زندگی کی نمود کے خوشگوار مرحلہ میں داخل ہو جائیں گے۔)

روئے زمین پر کیمیائی ارتقاء

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ...... (۴۰/۶۷)۔ "اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا مٹی (بے جان مادہ) سے کی۔"

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا ...... (۲۵/۵۴)۔ "اور وہی تو ہے جس نے تمہیں پانی سے پیدا کیا۔"

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ...... (۶/۲) "خدا تو وہ ہے جس نے تمہیں گارے سے پیدا کیا۔"

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝ (۳۷/۱۱) "انھیں ہم نے چپکتے ہوئے گارے سے بنایا ہے۔"

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ (۲۳/۱۲) "اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔"

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵/۱۴) "اس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔"

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ (۱۵/۲۶) "یہ حقیقت ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتداء ایسے کیچڑ سے ہوئی جو سَن رسیدہ ہو کر متغیر ہو چکا تھا۔"

مندرجہ بالا آیات کو اگر ایک ایک کر کے لیا جائے تو بات واضح نہیں ہوتی۔ لیکن اگر سب کو یکجا کر کے علوم سائنس کی روشنی میں ان پر غور و فکر کیا جائے تو تخلیقِ آدم کی نہایت خوبصورت اور مربوط داستانِ ارتقا سامنے آتی ہے۔ اسی کو تصریفِ آیات کہتے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ..... (۱۸/۵۴)

"دیکھو ہم کس طرح اس قرآن میں، لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر قسم کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کرتے ہیں تاکہ بات ہر گوشے اور ہر پہلو سے واضح ہو جائے۔"

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ہمارے اکثر مفسرین نے عیسائیوں کے خود تراشیدہ تصورات کی تقلید میں کہا کہ پہلے ایک مٹی کے پتلے سے آدم بنایا گیا، پھر اس کی پسلی چیر کر اس سے حوا نکالی گئی۔ لیکن قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ "ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتدا (مٹی کے پتلے سے نہیں) مٹی کے خلاصہ سے کی۔"

اب لیجئے سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ کی کہانی سائنس کی زبانی۔

مرحلہ اوّل

زمین کا آگ جیسا گولہ سورج سے الگ ہونے کے بعد اتنا زیادہ گرم تھا کہ اس کے ایٹمز باہمی ملاپ سے مرکبات نہیں بنا سکتے تھے۔ جب بتدریج اس کا درجہ حرارت اس سطح تک گر گیا کہ ایٹمز سے مرکبات کا بننا ممکن ہو گیا تو زمین کی باہر کی تہہ میں ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے ایٹمز کے ملاپ سے چھ مرکبات معرضِ وجود میں آئے۔

اور یہ چھ مرکبات حسبِ ذیل ہیں۔

پانی	H_2O	H—O—H
امونیا	NH_3	$H—N<^{H}_{H}$
میتھین (یہ وہی گیس ہے جو آج کل ہمارے ہاں ایندھن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے)	CH_4	H—C(H)(H)—H
کاربن ڈائی آکسائیڈ	CO_2	O = C = O
ہائیڈروجن سی اے نائیڈ	HCN	H — C — N
ہائیڈروجن مالی کیول یا سالمہ	H_2	H — H

جب زمین مزید سرد ہوئی تو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ہوا کا پانی جم کر بارش برسنے لگی جو صدیوں تک جاری رہی۔ یہ بارش ان چھ مرکبات کو جو اوپر ہوا میں موجود تھے بہا کر نشیب کی طرف لے آئی جہاں سمندر بن گئے۔ سمندروں کے پانی میں ان مرکبات کے علاوہ مزید اضافہ معدنیات کا ہوا۔ یہ کہاں سے آئے؟

ا۔ دریاؤں کا پانی پتھریلی زمین سے ٹکراؤ کی وجہ سے ان کو بہا کر سمندر میں لے گیا۔

ب۔ سمندر کا پانی ساحل سے ٹکرا کر انہیں اپنے اندر جذب کرتا رہا۔

ج۔ سمندر کے اندر لاوا پھوٹتا رہا۔

چنانچہ یہ اوپر سے آئے ہوئے چھ مرکبات بمع معدنیات ساحلِ سمندر کی مٹی میں جذب ہوتی گئیں۔ یہی بعد میں سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ بنیں اور انہیں سے زندگی کی ابتداء ممکن ہوئی۔

زندگی کی ابتدا میں پانی اور دیگر ابتدائی ایٹمز اور مرکبات کا کردار

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا... (۲۵/۵۴)

پانی کا کردار

زندگی پانی کے بغیر ممکن نہیں اور زندہ اشیاء کے جسموں کا سب سے اہم حصّہ پانی ہے۔ ایک جاندار کے جسم میں وزن کے لحاظ سے ۶۰ فیصد سے ۹۰ فیصد تک پانی ہوتا ہے۔ اوائل عمر میں زیادہ اور بڑی عمر میں کم۔ سمندری جانوروں کے جسم میں زیادہ اور خشکی پر رہنے والے جانوروں کے جسم میں کم۔ فی زمانہ سطح زمین کا ۴/۳ حصّہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ چنانچہ زندہ اشیاء کی معیشت میں پانی کا حصّہ بہت اہم ہے۔

پانی کے زندگی میں بنیادی رول کی وجوہات کیا ہیں؟

ا۔ (INORGANIC MATTER) بے جان مادہ اور (ORGANIC MATTER) زندگی خیز مادہ دونوں

پانی میں آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ پانی کے اندر جو (ELECTROLYTES) برقِ پوشیدہ موجود ہوتے ہیں۔ پانی ان کی DISSOCIATION افتراق کا سبب بنتا ہے۔ یہ الیکٹرولائٹ پانی کے اندر بجلی کی رَو گزرنے میں مدد دیتے ہیں۔

۳۔ پانی کا (SURFACE TENSION) سطحی تناؤ زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ پانی کی (FLUIDITY) سیلانیت بہت زیادہ ہے۔

۵۔ پانی میں گرمی کو جذب کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔

چنانچہ پانی کیمیائی جوڑ توڑ کے لئے بہترین (MEDIUM) واسطہ ہے۔ علاوہ ازیں ابتداء میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ذریعہ صرف پانی تھا۔ ان دونوں کے ایٹمز زندہ جسم کی تعمیر میں عمارتی اینٹوں کا کام دیتے ہیں۔ لیکن کرۂ ارض بننے کے بعد آکسیجن کے ایٹمز باہمی ملاپ سے پانی بن گئے اور ناپید ہو گئے۔ چنانچہ بعد کے زمانہ میں ان دونوں ایٹمز کا منبع پانی قرار پایا اور آج بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ ان صفات کی بنا پر زندگی کا دروازہ کھولنے کے لئے پانی نے چابی کا رول ادا کیا اور پانی میں حل شدہ مرکبات اور معدنیات ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد زندگی کا پیش خیمہ بنے۔ لیکن زمین پر زندگی کی نمود کے بعد بھی زندگی کے قیام کے لئے پانی کا حصہ بہت اہم ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

.... وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ...... ۝ (۲۱/۳۰)

"ہم نے تمام زندہ اشیاء کی نمود پانی سے کی"

..... وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ...... ۝ (۱۱/۷)

"(اس نے زندگی کی بنیاد پانی پر رکھی) اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا"

(نوٹ: ہمارے مفسرین نے مٹی سے بابا آدم بناتے وقت پانی کا کہیں ذکر نہیں کیا)۔

زندگی کی بنیاد میں کاربن کا رول

زندگی کی سٹیج پانی نے تیار کی اور اس اسٹیج پر سب سے بڑا اداکار کاربن بنا۔ کاربن ایک ایسا (VERSATILE ELEMENT) ہمہ دان مفرد ہے جس کا دوسرے مفردات کے ساتھ مل کر مرکبات بنانے میں کوئی ثانی نہیں۔ اس کی (CONVALENCE) قوتِ ملاپ چار ہے۔ یعنی کاربن کا ایک ایٹم چار دوسرے ایٹمز کے ساتھ بیک وقت ملاپ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کاربن ایٹم دوسرے ایٹمز کے ساتھ مل کر لمبی

لمبی زنجیریں بناتا ہے۔ مثلاً

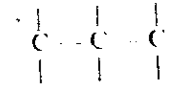

لیکن یہ کھلی زنجیریں نہیں ہوتیں۔ یہ پیچیدہ مرکبات کا جزو بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر نیچے میتھین کے دو یا زیادہ سالمات آپس میں مل کر زنجیر بنا رہے ہیں جن کے ساتھ ہائیڈروجن ایٹمز کی ترتیب یہ ہے۔

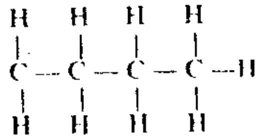

چنانچہ میتھین جیسے مرکبات نے ابتدائی سمندروں میں دوسرے مرکبات سے مل کر دیگر بہت پیچیدہ مرکبات پیدا کئے۔ ان مرکبات کو (ORGANIC COMPOUNDS) زندگی خیز مرکبات کہا جاتا ہے اور یہ مرحلہ زندہ مادہ کی پیدائش کے ارتقائی مراحل میں بہت اہم تھا۔

سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ کی ارتقاء کا دوسرا مرحلہ

اس (ORGANIC MATTER) زندگی خیز مادہ کے جو بے شمار مرکبات معرضِ وجود میں آئے۔ ان میں سے پانچ ارتقائی مراحل کے لحاظ سے اہم ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ SUGARS شوگرز، ۲۔ GLYCERINES گلسرینز، ۳۔ FATTY ACIDS چربیلا تیزاب
۴۔ AMINO ACIDS امائنوایسڈ، ۵۔ NITROGEN BASES نائٹروجن کے بنیادی مرکبات۔

ان مرکبات کی ساخت مندرجہ ذیل ہے۔ اس میں دیکھئے کہ ہر ایک کے اندر کاربن کی زنجیر موجود ہے اور باقی ایٹمز ہائیڈروجن آکسیجن اور نائٹروجن ان زنجیروں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

شوگرز: یہ کاربن کی چھوٹی زنجیریں ہیں جن میں ۵ یا چھ کاربن ایٹمز ہوتے ہیں۔ دوسرے عناصر ہائیڈروجن اور آکسیجن ہیں ایسے شوگر کو جس میں ۵ کاربن ایٹم ہوں PENTOSE کہتے ہیں اور جس میں چھ کاربن ایٹم ہوں HEXOSE کہتے ہیں۔

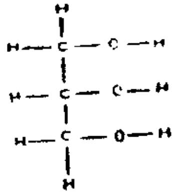

گلسرینز ان میں تین کاربن ایٹمز کی زنجیر ہے اور دوسرے ایٹمز شوگر کی طرح اوکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں۔

چربیلا تیزاب

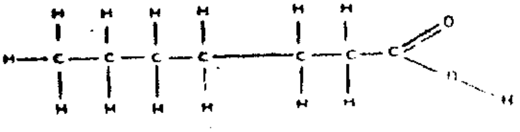

اس میں کاربن ایٹمز کی زنجیر ۲ تا ۲۰ ایٹمز کی ہوتی ہے۔ باقی ایٹمز ہائیڈروجن اور آکسیجن ہیں۔ اس کے ایک سرے پر کاربوکسل CARBOXYL گروپ ہوتا ہے۔

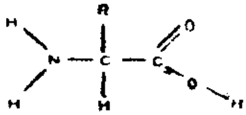

امائنوایسڈز: ان کے اندر بھی ایک کاربوکسل گروپ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کاربن کی زنجیریں مختلف لمبائی کی۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ ایک کاربن کا ڈھانچہ R مختلف ساخت کا ہوتا ہے۔

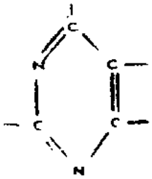

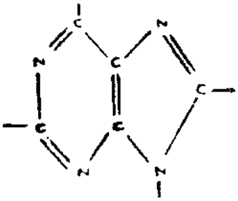

نائٹروجن کے بنیاد پر مرکبات

ان کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ پلیورینز اور پائیری میڈینز
ان میں کاربن اور نائٹروجن کی زنجیر کی بجائے RING چکر ہوتے ہیں۔ پائری میڈین میں ایک اور پیورین میں دو۔
زمین کی تخلیق کے ابتدائی حالات کے مطابق مندرجہ بالا ۵ مرکبات کی ترکیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرکبات یوں معرضِ وجود میں آئے۔

میتھین + میتھین + پانی = شوگرز، گلسرینز اور چربیلے تیزاب
(CH_4 CH_4 H_2O)

میتھین + پانی + امونیا = امائنوایسڈز اور نائٹروجن کے بنیادی مرکبات
(CH_4 H_2O NH_3)

اس کے علاوہ سی اے نائیڈز کی موجودگی سے کاربن اور نائٹروجن کے رنگ بنانے میں مدد ملی۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے۔ لیبارٹریز میں ان چیزوں پر بھرپور تجربات کئے گئے ہیں۔ ایک کتاب ہے THE ORIGIN OF LIFE جس کے مصنف ہیں OPARIN ہوں نے اپنی کتاب میں یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ زمین کے ابتدائی دور میں (ATMOSPHERE) ہوائی کرّے کے اندر میتھین، امونیا، پانی اور ہائیڈروجن موجود تھے اور زندگی خیز مادہ انہی مرکبات سے پیدا ہوا۔ اس نظریئے کو تسلیم کر کے اس پر تجربات کی ابتدا ہوئی۔ UREY BERNAL جیسے بڑے سائنسدانوں نے س پر تجربے کئے۔ پھر ۱۹۵۳ء میں STANELAY .L.MILLER نے امریکہ کی CHICAGO یونیورسٹی میں اس پر تجربہ کیا۔ اس تجربہ کے لئے ایک خاص آلہ ایجاد کیا۔ ایک چیمبر میں پانی کے بخارات میتھین ور امونیا رکھے گئے۔ اس میں سے مسلسل ایک ہفتہ تک بجلی کی رَو گذاری گئی۔ ایک فلاسک میں سے ابلتے ہوئے پانی سے بخارات نکل کر چیمبر میں داخل ہوتے تھے۔ اس طرح یہ پانی کا چکّر ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ شروع میں پانی کا رنگ ہلکا زرد تھا اور تجربے کے آخر میں پانی کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا۔ چنانچہ جو نئے مرکبات بنے ان کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ امائنو ایسڈ تیار ہوا ہے۔

انرجی کا مصدر

ہر کیمیائی جوڑ توڑ کے لئے انرجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کی ارتقار کے ابتدائی مراحل میں جو مرکبات بنے ان کے لئے انرجی کہاں سے آئی؟ ابتدائی زمین صدیوں تک بادلوں سے گھری رہی، بادلوں کے اندر بجلی اس کیمیائی ارتقار کے لئے انرجی مہیا کرتی رہی۔ علاوہ ازیں گو روشنی کی شعاعیں بادلوں میں سے گزر کر آگے نہیں جا سکتی تھیں لیکن دوسری زیادہ انرجی کی شعاعیں الٹرا وائیولیٹ اور ایکس رے وغیرہ ان بادلوں میں سے گزر سکتی تھیں۔ چنانچہ انرجی کی لہروں کے اثرات سے یا تو یہ (REACTIONS) کیمیائی تعامل زمین کے گرد گیسوں کے کرّے میں واقع ہوتے یا سمندر کے پانی کے اندر جہاں یہ کیمیائی مواد بارش کے پانی کے ذریعے پہنچا۔

کیمیائی ارتقار کا تیسرا مرحلہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلے مرحلے پر ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے ایٹمز کے باہمی تعامل سے چھ مرکبات معرضِ وجود میں آئے۔ پانی، امونیا، میتھین، کاربنڈائی آکسائیڈ، ہائیڈروجن سی اے نائیڈ اور ہائیڈروجن مالیکیولز۔ دوسرے مرحلے پر ان چھ مرکبات کے تعامل سے ۵ ابتدائی ORGANIC مرکبات پیدا ہوئے۔ شوگرز

گلسرینز، چربیلا تیزاب، امائنوایسڈز اور نائٹروجن کے بنیادی مرکّبات۔

اس کے بعد ان ابتدائی ORGANIC مرکّبات کے تعامل سے زیادہ پیچیدہ مرکّبات پیدا ہوئے۔ جنہیں LATER ORGANIC COMPOUNDS کہتے ہیں۔ ان میں پانچ بڑے گروپ پیدا ہوئے جن کے ملاپ سے زندگی کی نمود ہوئی۔ ان پانچ گروپوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ADENOSINE PHOSPHATES	ایڈی نوسین فاسفیٹس
۲۔ POLYSACCHARIDES	پالی سیکرائیڈز
۳۔ FATS	روغنیات (چربی وغیرہ)
۴۔ PROTEINS	لحمیات
۵۔ NUCLEIC ACIDS	نیوکلی اک ایسڈ

ایڈی نوسین فاسفیٹس

ایڈی نوسین فاسفیٹس مرکّبات کا ایک نہایت اہم گروپ ہے۔ ان کو (NUCLEOSIDES) نیوکلیوسائیڈ بھی کہتے ہیں۔ نیوکلیوسائیڈ کے ایک سالمہ میں سادہ شوگر اور نائٹروجن بیس کا مرکب ہوتا ہے۔

ربوس۔ (پانچ کاربن والا شوگر) + ایڈی نین (پارمیڈین) = ایڈی نوسین (نیوکلیوسائڈ)

ابتدائی سمندروں میں کئی قسم کے شوگر اور نائٹروجن بیس پیدا ہوئے ہوں گے اور ان کے باہمی تعامل سے نیوکلیوسائیڈ سمیت کئی ایڈی نوسین بنے ہوں گے۔ علاوہ ازیں سمندر کے پانی میں (PHOSPHATES کی بھی بہتات ہوگی۔ چنانچہ ان کے باہمی تعامل سے مندرجہ ذیل نیوکلیوٹائیڈز بنے۔

ایڈی نوسین + ۱ فاسفیٹ = ایڈی نوسین مانو فاسفیٹ (اے۔ ایم۔ پی)

ایڈی نوسین + ۲ فاسفیٹ = ایڈی نوسین ڈائی فاسفیٹ (اے۔ ڈی۔ پی)

ایڈی نوسین + ۳ فاسفیٹ = ایڈی نوسین ٹرائی فاسفیٹ (اے۔ ٹی۔ پی)

علمِ حیاتیات کی رُو سے فاسفورس کا انرجی کو ایک چیز سے دوسری چیز میں منتقل کرنے میں اہم رول ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ اے ڈی پی میں دو فاسفیٹ ہیں اور اے ٹی پی میں تین۔ اے ٹی پی میں انرجی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک جگہ سے انرجی کو قابو کرتی ہے اور دوسری جگہ منتقل کرتی ہے۔ اس عمل کو زندہ اشیاء میں بہت اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر جب انسان چلتا ہے یا کوئی اور کام کرتا ہے تو اس کے عضلات میں گلوکوس کا استعمال اسی اے ٹی پی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ گویا اے ٹی پی سورج سے

ہونے والی انرجی کا بدل ہے۔ علمِ حیاتیات میں یہ نکتہ بہت اہم ہے۔ زیادہ پیچیدہ مرکبات کے جوڑ توڑ بے حد انرجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سورج کی گرمی سے یہ انرجی حاصل کی جائے تو زندہ شے جل جائے گی۔ لئے ان پیچیدہ مرکبات کی تعمیر کے لئے کیمیائی انرجی اے ٹی پی سے حاصل کی جاتی ہے جو کہ ہر کیمیائی کے لئے موجود ہوتی ہے۔ مختصر الفاظ میں ہر کیمیائی عمل کے لئے انرجی کی ضرورت ہوتی ہے اور زندہ اشیاء یہ انرجی حاضر صورت میں اے ٹی پی کے مرکب سے دستیاب ہوتی ہے۔

پالی سیکرائڈز - POLYSACCHARIDE

دوسرا کیمیائی گروپ جو کیمیائی ارتقاء کے تیسرے مرحلے میں معرضِ وجود میں آیا اس کا نام ہے پالی سیکرائڈ (گلوکوس، چینی، گڑ، نشاستہ وغیرہ سب اس گروپ میں شامل ہیں) سادہ شوگر جس کا ذکر دوسرے گروپ یا تھا وہ مانو سیکرائڈ تھا۔ یعنی اس میں صرف ایک سیکرائڈ شامل تھا۔ ایک ہی قسم سے بہت سے شوگر مل کر پالی سیکرائیڈ بناتے ہیں جس طرح کہ نشاستہ ہے جس میں چند ہزار گلوکوس کی اکائیاں ہوتی ہیں CELLULOSE جو نباتات کے چھلکے کا مادہ ہے۔ اس میں ایک ہی قسم کے ۲۰۰۰ مانو سیکرائیڈ ہیں۔ ایک سیکرائیڈ میں دو یا زیادہ قسم کے سادہ شوگر ہوتے ہیں۔ پالی سیکرائیڈ مانو سیکرائیڈز کا مرکب نہیں ہوتا بلکہ ان کا ملاپ ہے۔ اس عمل کو POLYMERISATION کہتے ہیں۔

پالی سیکرائیڈز کی خصوصیات۔

1. یہ زندہ جسم میں بلڈنگ میٹیریل کا کام دیتی ہے۔
2. یہ انرجی کا منبع ہیں۔ جس طرح ہماری خوراک میں میٹھی چیزیں ہیں۔

روغنیات FATS

یہ تیسرا کیمیائی گروپ ہے جو ارتقاء کے تیسرے مرحلے میں پیدا ہوا۔

یہ گلسرین اور چربیلے تیزاب کے جوڑ سے بنتی ہیں۔

گلسرین کا سالمہ ۱ + چربیلے تیزاب کے سالمات ۳ = چربی کا ایک سالمہ۔

روغنیات کی خصوصیات

1. بلڈنگ میٹیریل (جس طرح کہ انسانی جسم میں ہے)۔
2. انرجی کا منبع۔

روغنیات کی بے شمار کیمیائی قسمیں ہیں۔ جن کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان میں کس قسم کے چربیلے تیزاب استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن ابتدائی سمندروں میں اگر اے ٹی پی اور پالی سیکرائیڈ اور روغنیات تینوں چیزیں موجود بھی ہوتیں تو بھی زندہ اشیاء معرضِ وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔

چنانچہ زندگی کا وجود دو اور مرکبات کے ذریعے ممکن ہوا ایک پروٹین اور دوسرے نیوکلی اک ایسڈ۔

لحمیات PROTEINS

یہ مرکبات کا چوتھا گروپ ہے جو کیمیائی ارتقار کے تیسرے مرحلے میں پیدا ہوا۔ پروٹین، امائنو ایسڈ کا POLYMER ہوتا ہے۔ یعنی بہت سے امائنو ایسڈ یکجا مل کر پروٹین بناتے ہیں۔ پروٹین بلڈنگ میٹریل ہے لیکن اس کی لاانتہا پیچیدہ شکلیں ہیں جو کہ پولی سیکرائیڈ کی نسبت زیادہ اہم ہیں۔ گویا اس کے بغیر زندہ اشیاء کے اجسام کی تعمیر ممکن نہ تھی۔ پروٹین کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ (ENZYME) خمیر کا کام بھی کرتی ہے اور حیاتیاتی تعامل کی رفتار میں بے حد اضافہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ پروٹین کے معرضِ وجود میں آنے سے پیشتر جن کیمیائی مرکبات کے باہمی تعامل میں صدیاں گزر جاتی تھیں وہ اب منٹوں اور سیکنڈوں میں سرانجام پا جاتے ہیں۔ پروٹین نہ صرف ان تعامل کی رفتار کو تیز کرتے ہیں بلکہ ان کو کنٹرول بھی کرتے ہیں۔

نیوکلی اک ایسڈ (NUCLEIC ACIDS)

یہ پانچواں کیمیائی گروپ ہے جو تیسرے ارتقائی مرحلے میں پیدا ہوا۔ ارتقار کے پہلے مرحلے میں سادہ کیمیائی سالمات پیدا ہوئے۔ مثلاً پانی، امونیا وغیرہ۔ اگلے مرحلے میں پیچیدہ سالمات مثلاً امائنو ایسڈ وغیرہ پیدا ہوئے۔ اس سے اگلے مرحلہ میں پروٹین وغیرہ پیدا ہوئے۔ اسی مرحلے میں ایک اور عجیب و غریب مرکب معرضِ وجود میں آیا جسے نیوکلی اک ایسڈ کہتے ہیں جس کی خصوصیات باقی سب سے مختلف ہیں اور وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ اپنے بلڈنگ بلاکس کا چربہ تعمیر کرتا ہے۔

۲۔ یہ نئی کیمیائی وضع یا ہیئت (CHEMICAL CONFIGURATTON) اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بعد اپنے تولید کے عمل کو بھی جاری رکھتا ہے۔

ان میں سے پہلی خاصیت کا نام ہے SELF DUPLICATION یعنی اپنی مانند دیگر سالمات تیار کرتے جانا۔

دوسری خاصیت کا نام ہے MUTATION جسے اچانک تبدیلی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں زند

سیاست کے تنظیمی ڈھانچے کے بنیادی اصول ہیں۔

نیوکلی اک ایڈز، نیوکلیوٹائیڈز کے POLYMERS ہیں۔ یعنی بہت سے نیوکلیوٹائیڈز کے سالمات کی وابستگی سے نیوکلی اک ایڈ کا سالمہ بنتا ہے۔ نیوکلی اک ایڈز کا سالمہ پروٹین کے سالمہ کے برابر بلکہ اس سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ نیوکلی اک ایسڈ کے تنظیمی ڈھانچے لاتعداد قسم کے ہیں۔ اس کے ایک سالمے میں نیوکلیوٹائیڈز کی بے شمار قسمیں اور غیر معینہ تعداد ہوتی ہے۔

نیوکلی اک ایسڈ کی خصوصیات کی مزید وضاحت

۱۔ نیوکلی اک ایڈ اپنے (STRUCTURAL CODE) تنظیمی قوانین کے ذریعے حیاتیاتی خبر رسانی کا کام دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم کہتے ہیں۔

پ۔ ا۔ ک۔ س۔ ت۔ ا۔ ن، تو سمجھ میں آتا ہے کہ پاکستان کہا گیا ہے لیکن پاکستان کا لفظ صرف اسی صورت میں سمجھ آئے گا جب ہم ان حروف کو ایک خاص ترتیب سے بولیں۔ اگر ان حروف کی ترتیب بدل لیں تو لفظ پاکستان کی بجائے کچھ اور بن جائے گا۔ اس طرح نیوکلیوٹائیڈز کو اگر ایک خاص ترتیب میں آگے پیچھے جوڑ دیں تو وہ ایک خاص پروٹین کی تعمیر کی خبر دیں گے۔ گویا نیوکلیوٹائیڈز کی ترتیب سے پتہ چلے گا کہ کس قسم کے امائنو ایڈ اس میں فٹ ہو کر کون سی پروٹین بنائیں گے۔ چنانچہ ایک خاص پروٹین کا انحصار نیوکلیوٹائیڈز کی ایک خاص ترتیب پر منحصر ہو گا۔

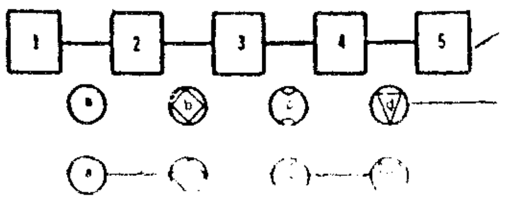

تصویر۔ نیوکلی اک ایسڈ پروٹین کی تعمیر کی ترتیب کی اطلاع دیتا ہے۔

اس تصویر میں ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ نیوکلی اک ایسڈ کی زنجیر کا ایک حصہ ہے۔ اس میں زنجیر کے ۱ اور ۲ ٹکڑوں کے درمیان ایک مخصوص قسم کا امائنو ایسڈ (a) فٹ آئے گا کوئی دوسری قسم اس کے اندر نہیں سما سکے گی۔ اس طرح ۲ اور ۳ کے درمیان امائنو ایسڈ (b) سما سکے گا اور ۳ اور ۴ کے درمیان امائنو ایسڈ (c) وغیرہ وغیرہ۔ اور جب یہ تمام امائنو ایسڈز آپس میں اکٹھے ہوں گے تو ایک خاص پروٹین معرضِ وجود میں آئے گی جس کے ڈھانچہ کی تعمیر نیوکلی اک ایسڈ ۱۔۲۔۳۔۴۔۵ کی CODE OF INFORMATION کی رُو سے ہو گی۔

چنانچہ آج تمام جاندار اشیاء میں پروٹین کے تنظیمی ڈھانچے کی ہدایت نیو کلی اک ایسڈ کے ذریعے ملتی ہے. یہ ایک اہم چیز ہے کیونکہ جس طرح ایک انجن یا کوئی دوسری مشینری لوہے کی بنی ہوتی ہے۔ اسی طرح زندہ اشیاء کا جسم پروٹین کا بنا ہوا ہوتا ہے اور ایک پروٹین دوسری اپنی قسم کی پروٹین کے بنانے میں ENZYME خمیر کا کام بھی دیتی ہے. گویا آخر میں زندہ اشیاء کی تعمیر کا دارومدار نیو کلی اک ایسڈ پر ہے۔

اپنی تولید آپ (AUTO - REERODUCTION)

اوپر بیان کی گئی تخلیقی ہدایت کی صفت سے بہرہ ور ہونے کے طفیل نیو کلی اک ایسڈ کی دوسری صفت "خود اپنی تولید" بھی ایک انوکھی صفت ہے. گویا نیو کلی اک ایسڈ ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ. خود اپنے ماڈل تیار کرتا جاتا ہے۔ نیو کلی اک ایسڈ کے ایک سالمہ سے بعینہٖ اسی طرح کا دوسرا سالمہ تیار ہو جاتا ہے۔ ایک نیو کلی اک ایسڈ سے دوسرا نیو کلی اک ایسڈ تیار ہونے کی طرزِ تعمیر وہی ہے جو نیو کلی اک ایسڈ سے پروٹین تیار ہونے کی ہے. پروٹین کی تیاری میں خام مادہ امائنو ایسڈ تھے اور نیو کلی اک ایسڈ کی تیاری میں خام مادہ نیو کلیو ٹائیڈز ہیں۔ چنانچہ نیو کلی اک ایسڈ کے سالمات خود اپنے جیسے سالمات بغیر کسی دوسری مدد کے خود تیار کرتے ہیں۔

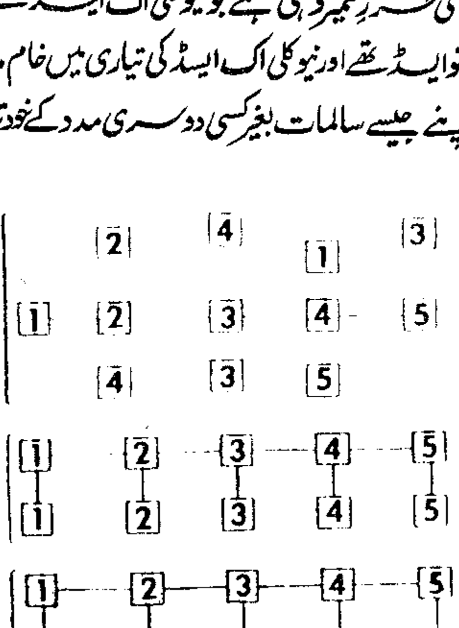

تصویر۔ نیو کلی اک ایسڈ کا چربہ

(الف) کے بالمقابل ایک نیو کلی اک ایسڈ پڑا ہے۔ اور اس کے گرد مختلف نیو کلیو ٹائیڈز بکھرے پڑے ہیں۔

(ب) کے بالمقابل نیو کلی اک ایسڈ کا کوئی خاص نیو کلیو ٹائیڈ صرف اپنی قسم کے دوسرے نیو کلیو ٹائیڈ کو اپنی طرف کھینچے گا۔

(ج) کے بالمقابل نئے نیو کلیو ٹائیڈز اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچ کر آپس جڑ جائیں گے۔

(د) کے بالمقابل نیا نیو کلی اک ایسڈ تیار ہو کر اپنے ماڈل سے الگ ہو جائے گا۔

سب سے پہلا نیو کلی اک ایسڈ غالباً اتفاقیہ معرضِ وجود میں آ گیا ہو گا. لیکن بعد میں ایک سے دو، دو سے چار کے نئے سالمات بنتے گئے۔ چنانچہ تولید کا عمل جو کہ زندہ اشیاء کا خاصہ ہے. درحقیقت زندگی کی نمود سے

معرض وجود میں آچکا تھا۔ جس قسم کی پروٹین سے جاندار شے کی ایک نسل کا جسم بنتا ہے اسی قسم کی پروٹین سے اس کی اگلی نسل بنتی جاتی ہے اور اس کی ہدایت نیوکلی اک ایسڈ کے ذریعے ملتی جاتی ہے۔ اس طرح ہر نسل کی پروٹینز کی قسم وہی ہوتی ہے جو اس کے آباء و اجداد کی تھی۔

اچانک تبدیلی MUTATION

خود تولید کی صفت سے متعلق نیوکلی اک ایسڈ کی ایک اور منفرد صفت ہے جو بعد میں زندہ اشیاء کی ارتقاء کا خاصہ بن گیا۔ یہ ہے اس کے سالمات کا اپنی خود تولید کی صفت کو ضائع کئے بغیر نئی شکل اختیار کرنا۔ نیوکلی اک ایسڈ کے سالمات میں بڑی پختگی ہوتی ہے۔ یہ روئے زمین پر کارفرما طبعی اور کیمیائی طاقتوں سے جلد متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن بعض اوقات بعض کیمیائی اور طبعی طاقتیں مثلاً الٹراوائیولیٹ شعاعیں ان کی ساخت میں معمولی تغیّر پیدا کر دیتے ہیں۔

ایک نیوکلیوٹائیڈ میں میوٹیشن یا فوری تبدیلی

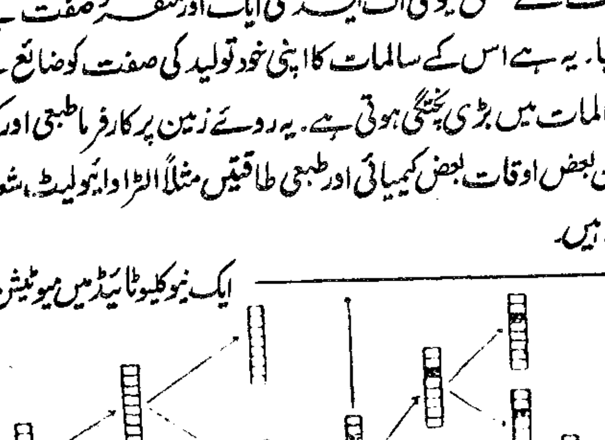

بدلی ہوئی شکل منتقل ہوگئی

بنیادی نیوکلی اک ایسڈ کی خاصیتیں بغیر تبدیلی کے منتقل ہوتی گئیں۔

تصویر۔ نیوکلی اک ایسڈ میں میوٹیشن کا عمل

یہ تغیّر مندرجہ ذیل صورتوں میں نمودار ہو سکتے ہیں۔

(۱) نیوکلی اک ایسڈ کے کسی ایک نیوکلیوٹائیڈ کی ساخت میں تبدیلی یا نیوکلیوٹائیڈز کی زنجیر کا کچھ حصّہ کسی ایک مقام سے الگ ہو جاتا ہے اور کسی دوسری جگہ پر جا کر جڑ جاتا ہے۔ یعنی ان کی ترتیب بدل جاتی ہے یا الٹا جڑ جاتا ہے یا یہ کہ ترتیب درست رہتی ہے لیکن تولید کے وقت ایک غلط قسم کا نیوکلیوٹائیڈ صحیح جگہ پر جُڑ جاتا ہے۔ (دیکھئے اگلے صفحہ کی تصویر)۔

یہ اغلاط مستقل صورت اختیار کر لیتی ہیں اور تغیّر شدہ نیوکلی اک ایسڈ پختہ ہو کر تولید کے عمل کو جاری رکھتا

ہے اور نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کا مستقل تغیر MUTATION یا "اچانک تبدیلی" کہلاتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی زمین پر جو نیوکلی اک ایسڈ پیدا ہوتے وہ نہ صرف اپنی قسم کو جنم دیتے رہے بلکہ آئندہ نسلوں میں اپنے آباؤ اجداد سے مختلف صورت بھی اختیار کرتے گئے۔

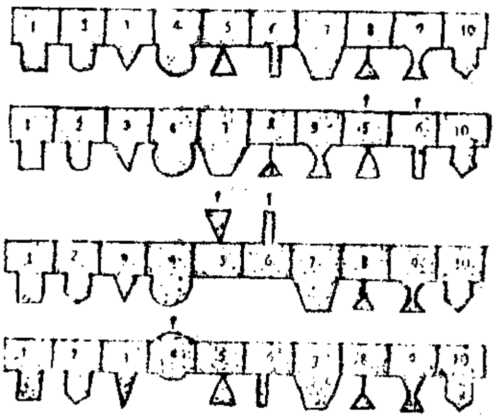

ابتدائی نیوکلی اک ایسڈ کی کڑی

نیوکلیوٹائیڈز ۵ اور ۶ اپنی جگہ سے الگ ہو کر غلط جگہ پر جُڑ گئے۔

نیوکلیوٹائیڈز ۵ اور ۶ اصل جگہ سے الگ ہونے کے بعد پھر اسی جگہ جڑ گئے لیکن الٹی حالت میں

عملِ تولید کے وقت نیوکلیوٹائیڈ ۴ کی جگہ ایک نیا نیوکلیوٹائیڈ جڑ گیا۔

تصویر۔ میوٹیشن کی مختلف صورتیں

چونکہ نیوکلی اک ایسڈز وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔ اس لئے آئندہ نسلوں میں پروٹین جن کی ساخت کا انحصار نیوکلی اک ایسڈ پر ہے اس کی قسمیں بھی بدلتی گئیں اور پروٹین چونکہ زندہ اشیاء کی تعمیر کی اینٹیں ہیں۔ اس لئے مختلف قسم کی جاندار اشیاء پیدا ہوتی گئیں۔ چنانچہ نیوکلی اک ایسڈ کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد زمین کا کیمیائی ارتقاء ایک بالکل نئی شکل اختیار کر گیا۔ ان کی وجہ سے تولیدی رہنمائی (GENETIC INFORMATION) ایک نسل کے سالمات سے دوسری نسل کے سالمات میں منتقل ہوتی گئی اور بالواسطہ پروٹین کی (SYNTHESIS) ترکیب و تالیف بدلتی گئی۔ علاوہ ازیں نیوکلی اک ایسڈز متغیر اشکال کے باوجود مستحکم رہے۔

مندرجہ بالا ۵ کیمیائی گروپ جو ارتقاء کے تیسرے مرحلے میں پیدا ہوئے' چونکہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں اور زندگی کے ارتقاء کا پیش خیمہ ان کے بغیر سمجھ نہیں آتا جس کی وجہ سے مفسرین زندگی کی ابتداء کے متعلق اور انسان کی پیدائش کے متعلق جگہ جگہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اس لئے اس کو اختصار کے ساتھ دوبارہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کی ذہنی گرفت مضبوط ہو جائے۔

بعد میں پیدا ہونے والے زندگی خیز مادہ کا خلاصہ

۱۔ ایڈی نوسین فاسفیٹس ۲۔ روغنیات ۳۔ پالی سیکرائیڈ (یعنی میٹھی اور نشاستہ والی اشیاء)
۴۔ پروٹینز ۵۔ نیوکلی اِک ایسڈز۔

۱۔ ایڈی نوسین فاسفیٹس (نیوکلیوٹائیڈز)

ربوس (پانچ کاربن والا شوگر) + ایڈی نین (پیورین) = ایڈی نوسین (نیوکلیوسائیڈس)

نیوکلیوٹائیڈز	ایڈی نوسین + ۱ فاسفیٹ = ایڈی نوسین مانو فاسفیٹ	(اے۔ ایم۔ پی)
	ایڈی نوسین + ۲ فاسفیٹ = ایڈی نوسین ڈائی فاسفیٹ	(اے۔ ڈی۔ پی)
	ایڈی نوسین + ۳ فاسفیٹ = ایڈی نوسین ٹرائی فاسفیٹ	(اے۔ ٹی۔ پی)

خاصیتیں

انرجی کو قابو کرتے ہیں اور تقسیم کرتے ہیں۔

۲۔ FATS روغنیات

گلسرین کا ایک سالمہ + چربیلے تیزاب کے تین سالمات = روغن کا ایک سالمہ
خصوصیات : ۱۔ بلڈنگ میٹریل، ۲۔ انرجی کا منبع
روغنیات کی بے شمار قسمیں ہیں جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی تعمیر میں کس قسم کے چربیلے تیزاب استعمال ہوتے ہیں۔

۳۔ پالی سیکرائیڈز

یہ شوگر کے سالمات POLYMER ہیں۔ (یعنی بہت سے سالمات کا اجتماع)۔ اس کے لئے انرجی کی سپلائی منبع اے ٹی پی ہے۔

مثال :۔ گلائیکوجن نشاستہ میں سادہ شوگر کے چند ہزار سالمات ہیں۔

خاصیتیں :۔ ۱۔ بلڈنگ میٹریل ۲۔ انرجی کا منبع۔

پروٹینز

امائنوایسڈ کے POLYMER ہیں۔ (یعنی بہت سے امائنوایسڈز کا اجتماع) پروٹین کے ایک سالمہ میں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ امائنوایسڈز کے سالمات ہو سکتے ہیں۔ قریباً دو درجن کے قریب امائنوایسڈز معلوم ہیں۔ ان کی کوئی تعداد، کوئی قسم اور کوئی ترتیب پروٹین کا سالمہ بنانے میں استعمال ہو سکتی ہے۔

خاصیتیں:- ۱۔ بلڈنگ میٹریل، ۲۔ اینزائمز (خمیر)

نیوکلی اک ایسڈز

نیوکلیوٹائیڈز کا POLYMER ہے۔ اس کے بعض سالمات پروٹین جتنے یا اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔

خاصیتیں:- ۱۔ رہنمائی، ۲۔ تولید، ۳۔ میوٹیشن (یا سالمہ میں فوری تبدیلی)۔

مندرجہ بالا واقعات جواب تک بیان ہو چکے ہیں یہ سالماتی ارتقاء کے متعلق ہیں۔ مختصر الفاظ میں زمین کے ابتدائی سمندروں میں سات قسم کے کیمیائی مرکبات بارش کے پانی سے دُھل کر جمع ہو گئے۔

بے جان مادہ:- ۱۔ پانی اور ۲۔ معدنیات۔

زندگی خیز مادہ

۱۔ ایڈی نوسین فاسفیٹس ۲۔ کاربوہائیڈریٹس (یا پالی سیکرائیڈز ۳۔ روغنیات
۴۔ پروٹینز ۵۔ نیوکلی اک ایسڈ۔

اس کے بعد ہم کیمیائی ارتقاء کے نہایت دلچسپ مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں جس میں زندگی کی نمود ہوئی اور انہیں سات مرکبات سے زندگی کی اکائیاں یا CELL پیدا ہوئے۔

(جاری ہے)

نُورِ مُبین

موضوع آپ دیجئے قرآنی راہنمائی طلوعِ اسلام پیش کریگا۔
— ایڈیٹر

اِسلام

اِسلام (مادہ س۔ل۔م)۔ یہ مادہ بڑا جامع ہے۔ اور اس سے جو الفاظ بنتے ہیں وہ وسیع المعانی ہیں۔ بنیادی طور پر اس مادہ کی مختلف شکلوں سے حسب ذیل معانی مرتب ہوتے ہیں :۔

(۱) ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ہو جانا۔ اس طرح مکمل ہو جانا کہ اس میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔

(۲) ہر قسم کے خطرات، آفات و حوادث سے محفوظ رہنا۔ سلامتی حاصل کرنا اور دوسرے کو سلامتی عطا کرنا۔

(۳) وہ ذرائع جن سے کوئی شخص نہایت حفاظت اور اطمینان سے بلندیوں تک پہنچ جائے۔

(۴) اطاعت، انقیاد، سپردگی، جھک جانا، سرِ تسلیم خم کر دینا۔

(۵) اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور لغویت اور بیہودگیوں سے بچنا۔

(۶) حسن و خوشنمائی۔

کائنات میں ہر شے قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ وہ ان قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتی ہے۔ اس سے ہر شے نشو و نما پاتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ یعنی جو کچھ اس نے بننا ہوتا

ہے وہ کچھ بن جاتی ہے۔ اور نظامِ کائنات نہایت امن اور سلامتی اور اعتدال و توازن کے ساتھ قائم ہے۔ اس روش اور طریق کو جس پر یہ کائنات چل رہی ہے، اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جس طرح کائنات کی ہر شے کے لئے قوانینِ خداوندی متعین ہیں، اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی قوانین عطا کئے گئے ہیں۔ اس ضابطہ قوانین کو الدین کہا گیا ہے۔ اور وہ طریق جس کے مطابق، انسان اس ضابطہ زندگی کو عملاً اختیار کرتا ہے، الاسلام کہلاتا ہے۔ اور اس طریق کو اختیار کرنے والوں کو مسلم کہا جاتا ہے یعنی وہ جو قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی نشو ونما کئے جاتے ہیں اور اس طرح خود بھی امن و سلامتی میں رہتے ہیں اور ساری دنیا کو بھی امن و سلامتی کی ضمانت دیتے ہیں۔

چونکہ وہ قوانینِ خداوندی، جن کے مطابق انسانوں کا چلنا مقصود ہے، اب اپنی آخری اور مکمل شکل میں، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اس لئے اب الاسلام کے معنی ہیں قرآنی قوانین و احکام و اصول کے مطابق عملاً زندگی بسر کرنا۔ (انبیاء سابقہ کو بھی اپنے اپنے وقتوں میں یہی قوانین دیئے گئے تھے۔ اس لئے ان کا طریقِ زندگی بھی اسلام ہی کہلاتا تھا۔ اور اس پر چلنے والے بھی مسلم۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اب الاسلام قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی کو کہا جائے گا اور اس طریق سے زندگی بسر کرنیوالوں کو مسلم)۔ خدا نے قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کا نام مسلم ہی رکھا ہے۔ اس لئے مسلم کے علاوہ کچھ اور کہلانا، یا اس کے ساتھ دیگر نسبتوں کا اضافہ کرنا، قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

بنیادی معانی کے اعتبار سے، مومن وہ ہیں جو قرآن کریم کی صداقتوں پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں اور مسلم وہ جو ان کے مطابق عمل کرتے ہیں لیکن چونکہ، قرآن کریم کی رو سے، ایمان بلا عمل یا عمل بلا ایمان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، اس لئے مومن اور مسلم کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور ایک آدھ مقام میں اَسْلَمَ محض اطاعت اختیار کر لینے کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

اسلام کی خصوصیات

(۱) گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنا دینا۔ (۲ : ۲۷) ــــ (۲ : ۲۱۳)
(۱۰ : ۱۹)

(۲) اسلام کسی خاص قوم، نسل یا گروہ کا دین نہیں۔ اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں۔ جس کا

جی چاہے اسے اختیار کرلے — (۲ : ۶۲) — (۲ : ۸۱ - ۸۲) — (۲ : ۱۱۱ - ۱۱۲) — (۲ : ۱۴۰) - (۲ : ۱۲۳ - ۱۲۵)

(۳) اس میں مشرق و مغرب کا بھی کوئی امتیاز نہیں — (۲ : ۱۱۵) - یعنی یہ زمان و مکان کی حدود سے ماورار ہے۔

(۴) اسلام خدائی راہنمائی کے مطابق چلنے کا نام ہے — (۲ : ۱۲۰)

(۵) قرآن پر اور تمام انبیاء سابقہ کی وحی پر ایمان لانے کا نام اسلام ہے۔ اس طرح ایمان لانا جس طرح مسلمان ایمان لاتے ہیں — (۲ : ۱۳۶ - ۱۳۷) — (۲ : ۲۸۵) — (۳ : ۸۳) — (۴ : ۱۳۶) - سابقہ انبیاء کی وحی پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ماننا ہے کہ وہ بھی اپنے اپنے وقت میں خدا کی راہنمائی لاتے تھے۔ لیکن اب وہ راہ نمائی صرف قرآن کے اندر ہے۔

(۶) یہ خدا کے رنگ میں رنگے جانا ہے۔ یعنی اپنے اندر بہ حدِ بشریت صفاتِ خداوندی کی نمود کرتے چلے جانا

(۲ : ۱۳۸)

(۷) اسلام یہ نہیں کہ مشرق کی طرف منہ کرلیا جائے یا مغرب کی طرف۔ اسلام یہ ہے کہ ...... — (۲:۱۷۷) یعنی محض چند رسوم کا میکانکی طور پر ادا کرلینا اسلام نہیں۔ اسلام بطیبِ خاطر قرآنی قوانین کیمطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے

(۸) دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل کرنے کا نام اسلام ہے — (۲ : ۲۰۱) — (۳:۱۴۷)

(۹) اسلام، انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ اس میں پورے کا پورا داخل ہونا چاہیئے۔ (۲ : ۸۵) - (۲:۲۰۸)

(۱۰) اسلام، دنیا اور آخرت دونوں میں غور و فکر کی تاکید کرتا ہے — (۲ : ۲۲۰)

(۱۱) دنیا کے تمام مظلوموں اور کمزوروں کی مدافعت کرنیوالا — (۲ : ۲۵۱)

(۱۲) اسلام، دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ صداقت کو ماننا ہے۔ اس میں کسی قسم کی زبردستی نہیں — (۲ : ۲۵۶)

(۱۳) احکامِ خداوندی کی پابندی سے خود انسانی ذات میں وسعت پیدا ہوتی ہے — (۲ : ۲۸۶)

(۱۴) اسلام، دنیاوی زینت و آرائش اور ساز و سامان سے متمتع ہونے کے خلاف نہیں — (۳ : ۱۳)
خدا کا مقرر کردہ نظامِ زندگی (دین) صرف اسلام ہے۔ یہی دین انبیاء سابقہ کو دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے متبعین اس میں اختلافات پیدا کر دیتے تھے — (۳ : ۱۸) — (۳ : ۸۴)

(۱۵) سابقہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، سب کیلئے اسلام کو بطور نظامِ زندگی اختیار کرنا ضروری ہے
(۳ : ۱۹) — (۳ : ۶۳)

۔ی اور کی نہیں۔ یہ حق کسی کو حاصل ہی نہیں کہ لوگوں

ب ——— (۳ : ۷۸)

عین کی آرزوؤں کے مطابق۔ بلکہ اعمال کے مطابق نتائج

ے سامنے جھکا دے' اس سے اچھا نظامِ زندگی اور کس کا ہو سکتا ہے

(۴ : ۱۲۵)

(۱۹) نا بعض پر ایمان لانا اور بعض پر ایمان نہ لانا، ایمان نہیں کفر ہے

(۴ : ۱۵۰) ——— (۴ : ۱۵۲)

(۲۰) قرآن میں پہنچ کر اسلام بہ حیثیت دین مکمل ہو گیا ——— (۵ : ۳)

(۲۱) جو تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ کر عقل و فکر سے کام لیتے ہیں' ان کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ ہو جاتا ہے ——— (۶ : ۱۲۶) ——— (۱۰ : ۱۰۰)

(۲۲) اسلام میں فرقہ بندی کی قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ شرک ہے ——— (۶ : ۱۶۰) ——— (۳۰ : ۳۲)

(۲۳) اسلام کا پیغام تو قرآن میں مکمل ہو گیا لیکن اس کا مکمل طور پر ایک نظام کی شکل میں متشکل اور متمکن ہونا، ضروری نہیں تھا کہ حضورؐ کی زندگی ہی میں ایسا ہو جاتا ——— (۴۰ : ۱۳)

(۲۴) اسلام کے متعلق اعلان کہ یہ اس طرح متمکن ہو گا کہ مخالفین حسرت سے پکار اٹھیں گے کہ اے کاش! ہم بھی مسلم ہوتے ——— (۱۵ : ۲)

(۲۵) اسلام میں ذات، گوت، پیشے کے امتیاز کو کوئی دخل نہیں۔ اصل شے ایمان ہے ——— (۲۶ : ۱۱۱-۱۱۲)

(۲۶) اسلام میں' دنیاوی نعمار کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ خانقاہیت کا مذہب نہیں ——— (۲۸ : ۷۷)

(۲۷) غور و فکر اسلام کی اولین خصوصیت ہے ——— (۴۴ : ۴۶)۔ مومن' احکامِ خداوندی کے سامنے کبھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھکتے ——— (۲۵ : ۷۳)۔ اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جاتی ہے ——— (۱۲ : ۱۰۸)۔

(۲۸) استسلام کے معنی فرماں پذیری ——— (۳۷ : ۲۶)۔ اَسْلَمَ کے معنی اس نے سر جھکا دیا ——— (۳۷ : ۱۰۳)

(۲۹) رحمتِ خداوندی سے مایوسی کفر ہے۔ انسان جب بھی قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جائے، اسے خدا کی طرف سے سامانِ نشو و نما مل جاتا ہے۔ (نشو و نما میں انسان کی طبیعی زندگی کی پرورش اور اسکی

ذات کی نشو ونما دونوں شامل ہیں ——— (۴۴—۵۳ : ۳۹)

(۳۰) دین کا نظام باہمی مشاورت سے قائم ہوتا ہے ———(۳۸ : ۴۲)

(۳۱) اسلام دینِ حقہ ہے۔ یہ تمام ادیان (دنیا کے مختلف نظامہائے حیات) پر غالب آ کر رہے گا ———

(۹ : ۳۳)—(۴۸ : ۲۸)—(۶۱ : ۹)

(۳۲) اسلامی حکومت کا مطیع ہو جانا، ایمان نہیں کہلاتا۔ ایمان دل کی گہرائیوں میں اترنا چاہیئے—(۴۹:۱۴)

(۳۳) کتاب (ضابطۂ قوانین) میزانِ عدل۔ اور عدل قائم رکھنے کے لئے فولادی قوت۔ یہ سب اسلام کے لاینفک اجزا رہیں—(۵۷ : ۲۵)

(۳۴) اسلام کا چراغ کسی کے بجھائے' بجھ نہیں سکے گا—(۳۲ : ۹)—(۸ : ۶۱)

(۳۵) یہ ایک ایسی تجارت ہے جو تمام نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے—(۱۰ : ۶۱)

(۳۶) اسلام میں نسل پرستی نہیں۔ نبی کی اولاد ہونا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا——(۱۲۴ : ۲)

(۳۷) دنیا میں برگزیدگی اور آخرت میں صالحین کے زمرے میں شمولیت۔ یہ ہیں اسلام کی خصوصیات—(۲:۱۳۰)

(۳۸) خدا آسانی چاہتا ہے۔ سختی نہیں چاہتا——(۱۸۵ : ۲)

(۳۹) خدا اور بندے کے درمیان کوئی ذریعہ اور واسطہ نہیں۔ کوئی حاجب و دربان نہیں۔ قرآن کے ذریعے انسان کا تعلق براہِ راست خدا سے قائم ہو جاتا ہے — (۱۸۶ : ۲)۔ [یہ تعلق خدا کی کتاب کے ذریعے قائم ہوتا ہے جو انسان کے ہر سوال کا جواب دیتا ہے]

(۴۰) دنیاوی اسباب اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت۔ یہ ہے اسلام——(۱۹۷ : ۲)

(۴۱) دنیا اور آخرت دونوں میں تفکر کرو———(۲۲۰ : ۲)

(۴۲) اسلام میں خدا، ملائکہ اور انسان تینوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی۔ فطرت کی قوتوں۔ اور انسانوں کی صالح جماعتوں کی تائید و رفاقت۔ کفر میں ان سے محرومی ہوتی ہے۔

(۳ : ۸۵—۸۶)

(۴۳) مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قلبِ سلیم کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے خود سپردگی کی ذہنیت رکھنے والا ———

(۳۷ : ۸۴)——(۲۶ : ۸۹)

کائنات کی ہر شے مُسلم (قوانین خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی) ہے

(۱) کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے ــــ (۲ : ۱۱۶)۔ اس لئے انسانوں کو بھی چاہیئے کہ اسی دین کو اختیار کریں ــــ (۳ : ۸۲)

(۲) کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ فطرت کی قوتیں (ملائکہ) انہی قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہیں اور ان سے کبھی سرتابی نہیں برتتے ــــ (۱۶ : ۴۸ــ۵۰) لیکن انسانوں میں سے اکثریت اس کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ کیونکہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ (۲۲:۱۸)

انبیاءؑ سابقہ اور اُمم گذشتہ کو بھی یہی تعلیم دی گئی تھی

(۱) حضرت ابراہیمؑ کی دعا کہ ہمیں بھی مسلم بنا اور ہماری نسل کو بھی ــــ (۲ : ۱۲۸)

(۲) حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی وصیت ــــ (۲ : ۱۳۲)۔ اولاد کا اقرار کہ ہم مسلم رہیں گے۔ (۲ : ۱۳۳)

(۳) حضرت عیسےٰؑ کے حواری اپنے آپ کو مسلم کہتے تھے ــــ (۳ : ۵۱) ــــ (۵ : ۱۱۱)

(۴) حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی، بلکہ مسلم تھے ــــ (۳ : ۶۶)

(۵) تمام انبیاءؑ کی طرف اصولی طور پر ایک ہی تعلیم بھیجی گئی تھی۔ اسی کا نام اسلام تھا ــــ (۴ : ۱۶۳)

(۶) تفریق بین الرسل کرنے والا کافر ہے ــــ (۴ : ۱۵۰)

(۷) انبیائے بنی اسرائیل احکامِ خداوندی کے سامنے جھکے ہوتے تھے ــــ (۵ : ۴۴)

(۸) رسول اللہؐ کا اعلان کہ میں سب سے پہلا مسلم ہوں ــــ (۶ : ۱۴) ــــ (۶ : ۱۶۴) ــــ (۲۷ : ۹۱) (۳۹ : ۱۲) ــــ (۴۰ : ۶۶)

(۹) جو ہدایت انبیائے سابقہ کو ملی تھی اسی کی اتباع رسول اللہؐ کرتے تھے ــــ (۶ : ۹۱)

(۱۰) اسلام ملتِ ابراہیمیؑ کا نام ہے ــــ (۶ : ۱۶۲)۔

(۱۱) تمام انبیاءؑ کی ایک ہی تعلیم تھی۔ یعنی اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں ــــ (۷ : ۵۹) ــــ (۷ : ۶۵) ــــ (۷ : ۷۳) ــــ (۷ : ۸۵)

(۱۲) دربارِ فرعون کے ساحرین کی دعا کہ ہمیں مسلم کی حیثیت سے موت دینا ــــ (۱۲۶ : ۷)
(۱۳) حضرت نوحؑ نے کہا کہ میں مسلم ہوں ــــ (۷۲ : ۱۰)
(۱۴) بنی اسرائیل احکامِ خداوندی کی اطاعت سے مسلم کہلائے ــــ (۸۴ : ۱۰)
(۱۵) حضرت یوسفؑ کی دعا کہ مجھے مسلم کی موت ماریو ــــ (۱۰۱ : ۱۲)
(۱۶) ہر رسول کی تعلیم کہ احکامِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرو اور غیر خداوندی قوتوں کی محکومیت سے اجتناب کرو ــــ (۳۶ : ۱۶) ــــ (۲۵ : ۲۱)
(۱۷) مختلف انبیاءِ سابقہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ سب ایک ہی برادری کے افراد تھے ۔ یعنی احکامِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے والے ۔ اسی سے امتِ واحدہ کی تشکیل ہوتی ہے (۲۱ : ۹۳) ــــ (۵۱ : ۲۳)
(۱۸) یہی تعلیم رسول اللہ کی تھی ۔ اسی کی طرف دعوت دے کر آپؐ لوگوں کو امتِ مسلمہ کا رکن بناتے تھے ــــ (۱۰۸ : ۲۱)
(۱۹) اسلام ملتِ ابراہیمیؑ ہے ۔ اسے ماننے والوں کا نام خدا نے مسلم رکھا تھا ۔ اُمم سابقہ میں بھی اور اب بھی ــــ (۷۸ : ۲۲)
(۲۰) وحی میں شروع سے آخر تک (تمام انبیاء کے سلسلہ میں) ربط رہا ہے ۔ اس لئے کہ اصولاً یہ پیغام ایک ہی تھا ــــ (۵۱ : ۲۸)
(۲۱) انبیائے سابقہ کی وحی اور قرآن پر ایمان لانے سے مسلم بنا جاتا ہے ۔ انبیائے سابقہ کی وحی پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرات اپنے اپنے وقت میں اصولی طور پر یہی پیغام خدا کی طرف سے لاتے تھے لیکن وہ پیغام محفوظ نہ رہا ہے اب وہی قرآن میں محفوظ ہے ــــ (۴۶ : ۲۹)
(۲۲) تمام انبیاءؑ کی طرف وحی کہ شرک سے اعمال غارت ہوجاتے ہیں ــــ (۶۵ : ۳۹) ۔ وہ توحید کی تعلیم دیتے تھے ــــ (۱۴ : ۴۱) ــــ (۴۵ : ۴۳)
(۲۳) تمام انبیاءؑ کی طرف یہی وحی کی گئی تھی کہ وہ دین کے نظام کو قائم کریں ۔ اور اس میں تفرقہ نہ ڈالیں ۔ یہ شرک ہے ۔ لوگ ان کے بعد دین میں تفرقہ پیدا کر دیتے تھے ــــ (۱۳ : ۴۲)
(۲۴) بنی اسرائیل کو کتاب و حکم و نبوت دی ۔ انہوں نے اختلافات شروع کر دیئے ۔ اس کے بعد

(۲۴) رسول اللہ کو وہی پیغام دے کر بھیجا گیا۔ اب اتباع اس کا ضروری ہے —— (۱۸-۱۶ : ۴۵)
(۲۵) رسول اللہ کوئی انوکھے رسول نہیں تھے —— (۹ : ۴۶)
(۲۶) حضرت لوطؑ کے پیروؤں کو بھی مومن اور مسلم کہا گیا ہے —— (۳۶-۳۵ : ۵۱)
(۲۷) صحفِ اولیٰ۔ صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں بھی یہی تعلیم تھی —— (۱۹-۱۸ : ۸۷)
(۲۸) سابقہ اہلِ کتاب کو بھی یہی تعلیم دی گئی تھی —— (۵ : ۹۸)

امتِ مسلمہ (مسلم)

(۱) یہ امتِ وسطیٰ ہے جس کا فریضہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی اور محاسبہ ہے —— (۲:۱۴۳)
(۲) اپنی خواہشات اور ارادوں کو منشائے خداوندی (قوانینِ خداوندی) کے تابع رکھنے والا مسلم ہے (۲:۲۰۸)
(۳) مرتے دم تک مسلم رہنے والی امت —— (۱۰۱ : ۳)
(۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والی قوم —— (۳ : ۱۰۳)۔ بہترین قوم جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے —— (۱۰۹ : ۳)
(۵) مومن ہمیشہ غالب رہیں گے —— (۱۳۸ : ۳)۔ کفار کبھی مومنین پر غلبہ حاصل نہیں کر سکینگے —— (۱۴۱ : ۴)
(۶) اسلام رسول اللہ کی وفات کے بعد بھی بدستور آگے چلیگا۔ امت اسے آگے چلائے گی —— (۳:۱۴۳)
(۷) ربط و ضبطِ باہمی سے امت کی قوت و جمعیت برقرار رہ سکتی ہے —— (۱۹۹ : ۳)
(۸) دین (نظامِ زندگی) کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ امت کا ایک مرکز ہو اور اس کے تابع باقی صاحبانِ اختیار۔ ان کی اطاعت سے یہ نظام قائم رہ سکتا ہے —— (۶۵—۶۴ ز ۶۱—۶۰ ز ۵۹ : ۴)
(۹) قتلِ مومن، سہواً اور عمداً —— (۹۳—۹۲ : ۴)
(۱۰) رسول کی مخالفت اور جماعتِ مومنین سے الگ راستہ اختیار کرنا امتِ مسلمہ کا شیوہ نہیں —— (۴:۱۱۵)
(۱۱) امتِ مسلمہ کو میزانِ عدل قائم کرنے کی تاکید —— (۱۳۵ : ۴)
(۱۲) جماعتِ مومنین کی خصوصیات۔ آپس میں انکسار۔ مخالفین کے سامنے صاحبِ غلبہ۔ مجاہدین فی سبیل اللہ۔ کسی کی ملامت سے نہ ڈرنے والے —— (۵۴ : ۵)
(۱۳) امتِ مسلمہ کا اعلان کہ ہم خدا کے احکام کے سامنے جھکنے والے ہیں —— (۷۱ : ۶)

اگر دنیا کی کوئی شے اور کوئی رشتہ دار، خدا، رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ عزیز ہوگئے تو وہ قوم گمراہ ہوگئی۔ اسلام سے اسے واسطہ نہ رہا ——— (۲۴ : ۹)

۱۴) منافق، مسلمان نہیں رہتا۔ منافقت کفر ہے ——— (۷۴ : ۹)

۱۵) مسلم کے معنی، احکام خداوندی کی فرمانبرداری اختیار کرنے والا ——— (۱۴ : ۱۱)

۱۶) دنیاوی نعمتیں اور آسائشیں اس لئے دی جاتی ہیں کہ انہیں احکام خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے۔ (۸۰—۸۱ : ۱۶)

۱۷) قرآن میں ہدایت تو سب کیلئے ہے لیکن خوشگواریاں انہی کے لئے ہیں جو اس کے قوانین واحکام کی اطاعت کرکے مسلم بنتے ہیں ——— (۸۹ : ۱۶)

۱۸) دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا، مشکلات میں مستقل مزاج رہنا، نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا، رزق کے سرچشموں کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھنا۔ یہ ہیں مسلم کی خصوصیات۔ (۳۵ : ۲۲)

۱۹) امتِ مسلمہ کو جب حکومت ملے گی تو ان کا فریضہ ان امور کو نافذ کرنا ہوگا جنہیں قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے اور ان سے روکنا جنہیں وہ ناپسندیدہ ٹھہراتا ہے نیز اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ——— (۴۱ : ۲۲)

۲۰) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے ——— (۷۸ : ۲۲)

۲۱) ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ دنیا میں حکومت اور تمکن کی زندگی ہے۔ اور یہ حکومت اس لئے ملتی ہے تاکہ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کیلئے ——— (۵۵ : ۲۴)

۲۲) مسلم کے لفظی معنی، محکوم، اطاعت گزار ——— (۴۲ ; ۳۸ ; ۳۱ : ۲۷)۔ جب کوئی شخص قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرے تو وہ قرآنی مفہوم میں مسلم ہو جائیگا ——— (۴۴ ، ۲۷)

۲۳) عقل وفکر سے کام لینے والا ہی مسلم ہوسکتا ہے (۸۰—۸۲ ، ۲۷) ——— (۵۲—۵۳ : ۳۰)

۲۴) ابتدائے اسلام میں، امتِ مسلمہ بہت کمزور تھی اسی لئے لوگ اس کی طرف آنے سے ڈرتے تھے کہ مخالفین اچک کر لے جائیں گے ——— (۵۷ : ۲۸)

۲۵) حسن کارانہ انداز سے اپنے امیال وعواطف (جذبات وخواہشات) کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھنے سے انسان مسلم ہوتا ہے ——— (۲۲ : ۳۱)

(۲۶) امتِ مسلمہ (کے مردوں اور عورتوں) کی جامع خصوصیات —— (۶ ۳–۳۵ : ۳۳)

(۲۷) امتِ مسلمہ وارثِ کتابِ خداوندی ہے۔ یہ لوگ تین مدارج یا طبقات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک بھلائی کے کاموں میں سب پر سبقت لے جانے والے۔ دوسرے بین بین چلنے والے۔ اور تیسرے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے —— (۳۲ : ۳۵) —— (۱۱-۷ : ۵۶)

(۲۸) جس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ ہو جائے وہ اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ روشنی میں آجاتا ہے۔ یعنی اُسے قرآن کی ہدایت مل جاتی ہے جو انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہے۔

(۳۹ : ۲۲)

(۲۹) جو خدا کی طرف دعوت دے، اعمالِ صالح کرے اور کہے کہ میں مسلم ہوں، اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟ —— (۳۳ : ۴۱)

(۳۰) ایمان لانے کے بعد احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنے سے انسان مومن اور مسلم ہوتا ہے (۶۹ : ۴۳)

(۳۱) خدا کی طرف پلٹ کر آئے اور مسلم ہو جائے۔ یہ روش صحیح ہے —— (۱۵ : ۴۶)

(۳۲) مسلمانوں کے غلبہ کو دیکھ کر ان کی حکومت کا مطیع ہو جانا، اسلام نہیں۔ اسلام نام ہے اس ایمان کا جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اس اعتبار سے مسلم اور مومن میں فرق ہوگا —— (۱۴ : ۴۹)

(۳۳) یہ لوگ اسلام لا کر تم پر احسان جتاتے ہیں۔ یہ تو ان پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف ہدایت کی —— (۱۷ : ۴۹)

(۳۴) امتِ مسلمہ کو وہ روشنی دی جسے لے کر وہ دنیا میں چلیں گے اور انسانوں کے راستوں کو روشن کریں گے —— (۲۸ : ۵۷)

(۳۵) جسے اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور وہ خدا پر افترا باندھے، اس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے —— (۷ : ۶۱)

(۳۶) مسلمان عورتوں کی خصوصیات —— (۵ : ۶۶)

(۳۷) مسلم اور مجرم کبھی برابر نہیں ہو سکتے —— (۳۵ : ۶۸)

(۳۸) عرب کے بادیہ نشین وحشی قبائل (جنّات) کا قبولِ اسلام۔ ان میں مسلم بھی تھے اور حق سے پھر جانے والے بھی —— (۱۴—۱۳ : ۷۲)

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

اپنی اپنی ذمّہ داری

تمہیں معلوم ہے کہ صبح کی سیر سے انسان کی صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ لیکن تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک شخص خود تو اپنے بستر میں لیٹا رہے اور اپنے نوکر سے کہے کہ وہ صبح اُٹھ کر، اُس کی جگہ تین میل کی سیر کر آیا کرے اور اس سے صحت اُس شخص کی اچھی ہوتی جائے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ بھی کبھی نہیں ہوتا کہ تم محنت سے پڑھتے رہو اور قابلیت اُس لڑکے کی بڑھتی رہے جو کتاب کو ہاتھ نہ لگائے اور سارا وقت کھیلنے میں ضائع کر دے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ
(۲/۲۸۶)

"جو اچھا کام کرے گا اس کا پھل اسی کو ملے گا۔ جو بُرا کام کرے گا اس کا نقصان بھی اُسی کو ہوگا۔"

دوسری طرف یہ بھی کہ

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝
(۵۳/۳۸)

"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

ہر ایک اپنے اپنے کام کا آپ ذمّہ دار ہوگا۔ نہ کوئی اپنا کام دوسرے

پر لادے گا اور نہ ہی ایسا ہو گا کہ کرے
کوئی اور بھرے کوئی۔
اِسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل
کہتے ہیں۔ یعنی وہ قانون جس کے مطابق
ہر شخص کو اس کے کاموں کا ٹھیک ٹھیک
بدلہ ملتا ہے۔

PERSONAL RESPONSIBILITY

We all know that morning physical exercise is good for health. But if a certain person who wants to improve his health himself keeps lying on the bed and asks his servant to go and have a daily three miles walk in his place, do you think it shall do him any good? The answer is no. This is not possible. Similarly it also cannot occur that a boy studies regularly everyday but the intellect of another boy, who never studies but wastes time in play, increases instead. Thus the Holy Quran proclaimed the law:

"It gets every good that it earns and it suffers every ill that it earns."

It means that one who does good shall be rewarded and one who acts badly, shall suffer the loss.

The Quran also declares:

"That no bearer of burdens can bear the burden of another."

Everybody shall be responsible for his own act The responsibility, of what he does, cannot be transferred to anybody else. This is called Allah's law of requital. Thus according to this law, every act shall be exactly repaid.

State. Quaid-e-Azam made this abundantly clear during his struggle for the achievement of Pakistan. In his Presidential Address delivered at the Annual Session of the All-India Muslim League, Delhi, on April 24,1943,he said:

> "Here, I should like to give a warning to the landlords and capitalists who have flourished at our expense by a system which is so vicious, which is so wicked and which makes them so selfish that it is difficult to reason with them. (Tremendous applause). The exploitation of the masses has gone into their blood. They have forgotten the lessons of Islam. Greed and Selfishness have made these people subordinate to the interests of others in order to fatten themselves. It is true we are not in power today. You go anywhere to the country-side. I have visited villages. There are millions and millions of our people who hardly get one meal a day. Is this civilization ? Is this the aim of Pakistan ? (Cries of NO, NO). Do you visualise that millions have been exploited and cannot get one meal a day. If that is the idea of Pakistan, I would not have it. (Cheers) If they are wise they will have to adjust themselves to the new modern conditions of life. If they don't, God help them: we shall not help them". (Hear, hear, renewed cheers and applause).
>
> *(Speeches and writings of Jinnah Vol-I, p.554)*

****

دنیا کے مشکل ترین مسئلہ — تقدیر — کا قابلِ فہم اور بصیرت افروز حل

قرآن کریم کی روشنی میں

کتاب التقدیر

محترم پرویز صاحب کی کتاب

قیمت -/۹۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

So far as the members of this society are concerned, the principle underlying the growth and development of their personality is expressed thus: an individual should work hard, earn and produce as much as possible, keep what is basically and essentially necessary for his own upkeep, and hand over the rest to the Islamic State for meting out the necessities of others in need, as is ordained in the Quran:

> "And they ask thee as to what should they give (for the benefit of others)"- Say: "Whatever is surplus to your own requirements" (2:219).

and in this, their attitude should be such as to declare:

> "We desire from you neither reward nor thanks" (76:9).

Here arises the question: What is the incentive motivated by which an individual should work, and continue to work, upto his full capacity, retain for himself only to the extent that fulfills his necessities, and make over the rest to the society, for meting out the necessities of others in need ? Still further :

> "They prefer others before themselves although there be indegence among them" (59:9).

Prof Hawtrey has said that:

> "What differentiates economic systems from one another is the character of the motives they invoke to induce people to work".
> *(Quoted by E.H.Carr, in "The New Society" PP.41-42)*

The motives provided by the Quran are unique, i.e.

> "Human body develops by what the individual concerned takes, while his Personality develops by what he gives".

This constitutes the basic motive for the establishment of the Quranic Economic Order.

There will thus be no capitalism and no land-lordism in an Islamic

which is unique in its nature. I have so far dealt with its social aspect only. So far as its economic side is concerned, it is a vast subject and requires detailed discussion. It will not be doing justice to it if it is touched upon enpassant. I have written exhaustively on the subject and my self-contained book— *Nizam-e-Rububiyyat* — discusses it in detail. Here, I will confine myself only to its basic principles.

The main object of an Islamic State is to provide the individual with full scope of self-development, which means development of his physical body as well as development of his personality. Its basic principles are that the individual is the focus of value and the society exists to enable the individual to develop and express himself to the full extent of his capacity. It lays primary stress on personal worth. A society based on these principles will be composed of free individuals, each enriching his life by working for the enrichment of all life and each moving onwards by helping others to do the same. This society should be judged by the solutions it offers for the social and economic problems that confront all human groups.

According to the Quran, it is incumbent upon the Islamic society to provide for the basic necessities of each and all the members comprising it, and make suitable arrangements for the development of their human potentialities. Therefore, it should extend the same facilities to other human beings and thus make this order universal. A society that fails in this responsibility does not deserve to be called Islamic, for, the society that is established in the name of *Allah* is bound to proclaim:

"We will provide for you and your children" (6:152).

It is paramountly clear from this that no society could discharge this responsibility unless, and until it has the various means of production under its control and the necessary resources at its disposal. It may be reiterated, and should in no case be lost sight of, that this society takes [illegible]der its control means of production with a view to discharge its huge [illegible]sibility of providing necessities of life for all the members of the [illegible] it fails to do so, it will have no right to touch these resources. It [illegible] act of usurpation in that case.

Question: What is the distinctive feature of Islamic State?

Answer: There is a special feature of the Islamic State which must not be overlooked. There, obedience is ...... due to God and God alone, which takes practical shape in the observance of the Quranic principles and commands. In Islam, obedience is due neither to a king, nor to a parliament, nor to any other organisation. It is the Quranic provisions which determine the limits of our freedom and restrictions in political and social spheres. In other words, Islamic State is an agency for enforcement of Quranic principals and injunctions.

In a Broadcast talk to the people of the United States of America on Pakistan, recorded in February 1948 i.e. in his capacity as Governor General of Pakistan, he said:

"The Constitution of Pakistan has yet to be framed by the Pakistan Constituent Assembly. I do not know what the ultimate shape of this constitution is going to be, but I am sure that it will be of a democratic type, embodying the essential principles of Islam. Today, they are as applicable in actual life as they were 1,300 years ago. Islam and its idealism has taught us democracy. It has taught equality of man, justice and fairplay to everybody. We are the inheritors of these glorious traditions and are fully alive to our responsibilities and obligations as framer of future constitution of Pakistan. In any case, Pakistan is not going to be a theocratic State— to be ruled by priests with a divine mission".

(Speeches as Governor-General p.65)

I have already explained what "democracy embodying the essential principles of Islam" means in practice: the way and means for the implementation of Quranic laws and principles to be framed by the *Ummah* by mutual consultation, within the immutable boundary lines determined by the Quran. This is what an Islamic State is permitted to do; beyond this it has no authority.

8. I have stated before that the Quran prescribes a socio-economic order

Ganges", says Gibbon, "the Quran is acknowledged as the fundamental code, not only of theology, but of civil and criminal jurisprudence, and the laws which regulate the actions and the property of mankind are regulated by the immutable sanctions of the Will of God." Everyone , except those who are ignorant, knows that the Quran is the general code of the Musalmans. A religious, social, civil, commercial, military, judicial, criminal penal code; it regulates everything from the ceremonies of religion to those of daily life; from the salvation of the soul to the health of the body; from the rights of all, to those of each individual; from morality to crime, from punishment here to that in the life to come, and our Prophet (PBUH) has enjoined on us that every Musalman should possess a copy of the Quran and be his own priest. Therefore, Islam is not confined to the spiritual tenets and doctrines and rituals and ceremonies. It is a complete code regulating the whole Muslim Society in every deptt. of life, collective and individually". (Ibid Vol-II, P-300).

In August, 1941, Quaid-e-Azam went to Hyderabad (Deccan) and there gave an interview to the students of the Usmania University. The replies he gave to the questions asked by the students, explain in a nut-shell the genesis and the ideology of Pakistan in such a comprehensive way that, in my opinion, nothing further would be required to understand these **basic** foundations. Here are extracts from that interview:

Question: What are the essential features of religion and a religious State ?

Answer: When I hear the word " religion', my mind thinks at once, according to the English Language and the British usage, of private relation between man and God. But I know fully well that according to Islam, the word is not restricted to the English connotation. I am neither a Maulvi nor a Mullah, nor do I claim knowledge of theology. But I have studied in my own way the Holy Quran and Islamic tenets. This magnificient Book is full of guidance respecting all human life, whether spiritual, or economic, political or social, leaving no aspect untouched".

the Presidential Address at Allahabad in 1930. Pakistan Resolution was passed in the Annual Session of the All India Muslim League, at Lahore, in 1940. Qaid-e-Azam said in his Presidential Address:

"It is extremely difficult to appreciate why our Hindu friends fail to understand the real nature of Islam and Hinduism. They are not religions in the strict sense of the word, but are, in fact, different and distinct social orders, and it is a dream that the Hindus and Muslims can ever evolve a common nationality, and this conception of one Indian nation has gone far behind the limits and is the cause of most of your troubles and will lead India to destruction if we fail to revise our notions in time. The Hindus and Muslims belong to two different religious philosophies, Social customs, literatures. They neither intermarry nor interdine together, and indeed, they belong to two different civilizations which are based mainly on conflicting ideas and conceptions. Their aspects of life and of life are different".

(Speeches and writings of Mr. Jinnah VOL-I pp.177-78)

In his speech at the Frontier Muslim League Conference on 21 Nov. 1945 he said:

"We have to fight a double-edged battle, one against the Hindu Congress and the other against British Imperialists, both of them being capitalists. The Muslims demand Pakistan where they could rule according to their own code of life and according to their own cultural growth, traditions and Islamic Laws". (Ibid, Vol-II,P.333).

In a message to NWFP Muslim Students Federation, in April 1943, he said:

"You have asked me to give you a message. What message can I give you ? We have got the great message in the Quran for our guidance and enlightenment". (Ibid Vol-I,P.516).

In Eid message to the nation in 1945, he said:

"Every Musalman knows that the injunctions of the Quran are not confined to religious and moral duties. "From the Atlantic to the

to solve its own problems".

(Lectures, p. 160)

It follows, therefore, that the general notion that the laws made by our earlier jurists and promulgated in the past are eternal and binding on all future generations, is against the basic teachings of Quran. This was thoroughly explained by Iqbal in his "Sixth Lecture", entitled- The principles of movement in the structure of Islam- in which he says:

"The question which is likely to confront Muslims countries in the near future is whether the Law of Islam is capable of evolution— a question which will require great intellectual effort, and is sure to be answered in the affirmative provided the world of Islam approaches it in the spirit of Omar— the first critical and independent mind in Islam who, at the last moments of the Prophet, had the moral courage to utter these remarkable words:" The book of *Allah* is sufficient for us."

(Lectures, p 154)

7. Iqbal accomplished his task and, handing over the torch to Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, passed away. The Quaid, during his struggle for the achievement of Pakistan, reiterated the main features of the proposed Islamic State, as enunciated by Iqbal. No doubt the British and the Hindus opposed tooth and nail the proposal for the establishment of a separate State for the Muslims, but its main opponents were the so-called " Nationalist Ulemas" who were the custodians of *Mazhab*, as already explained. Plainly speaking, the struggle for Pakistan was, in reality, struggle between *Deen* and *Mazhab*. This struggle was started during the life time of Iqbal himself. For want of adequate space, it is not possible to quote extensively from the speeches and writings of Quaid-e-Azam, on the subject. It would suffice if some of the more important points were cited.

It is generally said, that it was the narrow-mindedness of the Hindus and their maltreatment and fanatical prejudice towards the Muslims which compelled the latter to seek protection in a separate homeland, and thus the demand for Pakistan. This is not only distortion of history but also malicious propaganda. The genesis of Pakistan was explained by Iqbal in

is the goal of all human activities. Every act of his, performed in accordance with Permanent Values, contributes to its development, and whatever is done against these values, retards this process and weakens the Self. An act it should be noted, includes thought, wish and desire, as well. The Self or Personality thus developed easily sustains the shock of death and survives the disintegration and dissolution by physical body, and goes on developing further, passing through more evolutionary stages, which we call the "Hereafter" or the life after death. The fact that, not only the actual deeds of a human being but his thoughts, wishes and desires, as well act upon human personality, is what is called the "law of Retribution" which is as inexorable and immutable as the Laws of Nature.

It is the human personality which takes decisions, but at the present level of existence, its decisions are implemented through physical body. For this purpose, it is essential that human body should also develop and be in a position to carry out the commands of the Personality. For its development, the needs and requirements of human body will change from time to time whereas human personality, while developing shall remain un-changed. The renowned Polish Thinker, Nicholas Berdyaev, has beautifully concentrated this in four words , by saying:

> "Personality is changelessness in change".
>
> *(Slavery and Freedom - p.8)*

The process of the development of human body and Personality can take place only in Islamic Social Order (or *Deen*, as already explained). This order , generally called *Islami Nizam*, provides to each and every individual means for the development of both. This is generally called "*Nizam-e-Rabubiyyah*". It will be seen that this system differs basically from all other systems.

6. Reverting to the principle of law-making, Iqbal examined critically what had been going on in our past history, and said that:

> "The teaching of the Quran that life is a process of progressive creation necessitates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted

Islamic State. He says in his lectures:

> "The ultimate spiritual basis of all life, as conceived by Islam, is eternal and reveals itself in variety and change. A society based on such a conception of Reality, must reconcile in its life the categories of permanence and change; it must possess eternal principles to regulate its collective life; for, the eternal gives us a foothold in the world of perpetual change. But eternal principles when they are understood to exclude all possibilities of change, which, according to Quran is one of the greatest signs of *Allah*, tend to immobilize what is essentially mobile in its nature".
>
> *(Reconstruction of Religious Thought in Islam: Page.140).*

Iqbal has touched upon this very subtle, yet most important point with reference to political system of Islam, but it takes us far, far beyond political horizon. The fundamental principle of the reconciliation of the categories of permanence and change is not confined to the process of law-making. It is the very essence of Islam and can be appreciated only when the Quranic concept of human life is thoroughly grasped. There are two concepts of human life— materialistic and Quranic. The materialistic outlook of life treats man as any other animal, whose only function is to develop and enlarge his physical existence. It functions under physical laws and is disintegrated and gets extinct with death. It is subject to perpetual change; every moment millions and millions of cells, which constitute human body, are destroyed and replaced by fresh cells. This process of constant change continues till death overtakes him and he ceases to live. Since, according to this concept of life, there is nothing permanent in human life, it stands in need of no Permanent Values, no un-changeable principles, no immutable boundary lines, and therefore, no necessity for Divine Guidance.

According to Quranic concept of life, on the other hand, human body, no doubt develops, flourishes, and eventually disintegrates, under physical laws, but there is something else in man besides his body, that is, his Self or Personality, which is neither physical in its constitution nor is it subject to physical laws as such. It is endowed to every human child in like measure at his birth, but it is only in an undeveloped form. To develop it to its full maturity, and to give it a perfect and balanced shape

"It beseemeth not a man that *Allah* should give him the Book of Law, power to judge, and even *Nabuwwah*, and he should say to his fellow beings to obey his orders rather than those of *Allah*......."(3:78).

Quran forbids man to arrogate to himself the right to rule over other man: and yet it does not advocate a lawless, anarchical society. What it does is to lay down the principle that *Allah* alone has the right to rule over them (12:40) and none has the right to any share in it (18:26). Sovereignty belongs to *Allah* alone.

Allah, however is the Abstract, Transcendental Reality. How can we obey Him if we cannot contact Him? The answer is: by observing His Laws as given in His Book. This is why the *Rasul* was asked to declare:

"Shall I seek other than *Allah* for judge, when He it is Who hath revealed unto you this Book fully explained " (6:115).

This book was the criterion to decide whether a State was Islamic or un-Islamic. Says the Quran:

"Whoso do not judge by what *Allah* hath revealed, they are indeed Kafirs" (5:44).

The laws, directives, principles and values given by the Quran are complete, final, eternal and un-alterable. None, not even the entire *Ummah* has the authority to add to, subtract from or make any alteration therein. But it does not prescribe details thereof. With the exception of a very few laws, it demarcates the boundary lines of what is lawful and what is unlawful. These lines no one has the right to transgress: not even the entire community. Within these lines, the Islamic State is free to frame such bye-laws as the needs of the time require. These bye-laws are, of course, subject to change and may be revised or even abrogated by the *Ummah* by mutual consultation (42:38), leaving the boundary lines un-touched. This is where an Islamic State differs from the democracy of the West. According to Western democracy, the people have unbridled power to frame any laws, whereas, the consultative machinery of the *Ummah* can frame sub-laws only within the boundary lines framed by the Quran. Iqbal has beautifully narrated this unique feature of the

This point, i.e. to get rid of the "man-made Islam" was so basic and important that he laid emphasis on it time and again. In his famous six (to be more accurate, seven) lectures, he elaborated the theme in the words of (the late) Grand Vizier of Turkey Saeed Haleem Pasha, who had said:

> "During the course of history, the moral and social ideals of Islam have been gradually de-islamised through the influence of local character, and pre-Islamic superstitions of Muslim nations. These ideals today are more Iranian, Turkish or Arabian than Islamic. The pure brow of the principal of Tauheed (obedience to the Book of *Allah* alone) has received more or less, an impress of heathenism and the universal and impersonal character of the ethical ideals of Islam has been lost through a process of localisation. The only alternative open to us then is to tear off from Islam the hard crust which has immobilised an essentially dynamic outlook on life, and to re-discover the original verities of freedom, equality and solidarity with a view to rebuild our moral, social and political ideals out of their original simplicity and universality".
>
> *(Iqbal : Reconstruction of Religious Thought in Islam-pp.148-49)*

This was the purpose to be achieved, for which *Allama* Iqbal had given the idea of acquiring a piece of land to establish therein a State which could be identified as a true Islamic State— a State built on the foundations of Quran. This was to be a unique State amongst various States of the world.

5. One of the fundamental factors which makes Islamic State unique amongst various States of the world, whatever their form of Government, is its principle of law-making. As already stated, according to the Quran, all human beings are equal and worthy of equal respect and dignity. It necessarily follows, therefore, that no man has the right to exploit another man or to use him as a means in furthering his personal interests. If society were organised on this basis, there would be neither rulers nor the ruled; none would be permitted to compel others to obey him. *Allah* alone would be obeyed. Says the Quran:

in our time and from our own country, to distinguish between *Deen* and *Mazhab*, and the *Ummah* was called upon to revive true Islam in the light of the Quran. This was the voice of Iqbal, the great thinker, and still greater scholar of the Quran. This, he said was possible only if we had a piece of land in which a State was established purely on the lines indicated by the Quran, thereby wiping out completely the rule of man, in any form, be it capitalism or priestcraft. This scheme of his, he pronounced in his Presidential Address of the All-India Muslim League Session at Allahabad, in 1930. Such a State, he said:

> "Would mean security and peace for India resulting from an internal balance of power, and for Islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it to mobilise its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times."
>
> *(Speeches and statements of Iqbal-P. 15)*

Two years later, while addressing the nation at the Annual Session of the All India Muslim Conference at Lahore, on 21-3-1932, he said:

> "The possibilities of the faith you represent are not yet exhausted. It can still create a new world where the social rank of man is not determined by his caste or colour, or the amount of the dividend he earns, but by the kind of life he lives; where Capital cannot be allowed to accumulate so as to dominate the real producer of wealth. This superb ideal of your faith, however, needs emancipation from the medieval fancies of theologians and legists. Spiritually, we are living in a prison-house of thoughts and emotions which, during the course of centuries, we have woven round ourselves. And be it further said to the shame of us— men of older generation— that we have failed to equip the younger generation for the economic, political and even religious crisis that the present age is likely to bring. The whole community needs a complete overhauling of its mentality in order that it may again become capable of feeling the urge of fresh desires and ideals."
> (Ibid P.55)

revealed, was not only to communicate his revelation to others, but also to establish a socio-economic order in the light of that Guidance. Our *Rasul Muhammad* (PBUH)— established this order which fully recognized dignity of man as man, guaranteeing thereby complete equality of all human beings (17:70). The pursuit of individual interest was replaced by the ideal of the good of the humanity at large. Oppression and exploitation were abolished and justice and equity prevailed. The dependence of man upon man and the subjugation of one over another was brought to an end. Every individual was assured the proper satisfaction of his needs. He, thereby, led a full life of satisfaction, peace and harmony. He did not owe obedience to any person or power; except the Divine Laws enshrined in the Quran. Briefly, that Order completely put an end to the rule of man over man, in any form, and with it the evil of capitalism. This Order was called *Deen* in the Quranic terminology.

3. This social order prevailed during the life time of *Muhammad* (PBUH) and for some time thereafter, when the forces of exploitation began to raise their ugly heads again. They scored their first success with the establishment of *Mulukiyyat*— Kingship— sustained by capitalism . To ensure their survival and consolidation, these forces availed themselves of the co-operation of men who appeared in the robes of piety and spoke in the name of God. They posed as the interpreters of God's will and thus distorted principles and tenets of *Deen* which no longer remained a living force in the society and were reduced to a set of soul-less beliefs, lifeless dogmas and formal rituals divorced from reason and realities of life. They framed rules and laws to suit the purpose of monarchy, and sought to keep the common man entangled in the laybrinth of these dogmas and rituals, and the exploiters, religious as well as temporal, were left free to maintain their stranglehold upon the defrauded masses. This was the metamorphosis of *Deen* into *Mazhab*, which word, by the way, does not occur anywhere in the Quran. The Book of *Allah*, however, remained intact, since the responsibility of its preservation has been taken by *Allah* Himself, although it was never allowed to play any part in the practical life of the Muslims.

4. This state of affairs prevailed throughout the Muslim countries for centuries together where *Mazhab* was accepted as true Islam. We should, however, consider ourselves fortunate in as much as a voice was raised

THE GENESIS AND IDEOLOGY OF PAKISTAN

G. A. PARWEZ

The history of mankind makes tragic reading. Down through the ages, we come across a series of sequences of the rise, growth, decline and fall, not only of nations but even of their civilizations and cultures. No doubt, man has all along shown a remarkable constructive genius, having attained many an awe-inspiring successes, despite occassional set-backs and natural catastrophes. But his constructive genius was always undermined by some inherent weakness underlying his ideals, or his way of life which ultimately brought about a disastrous end to his efforts. Nevertheless, there have been some notable exceptions in the series of sequences when the idea of universal welfare of mankind took practical shape, but the main characteristic in all those civilizations, always remained one of frustration. Man struggled hard to find some satisfactory solution of his problems, but failed. Human intellect, limited as it is helped him little, because it is not aware of any source of knowledge other than itself. There was only one guide left for mankind in this difficult quest; and that confidently proclaimed its competency to lead them to their goal:

> "*Allah* who has created all the objects in the universe has also undertaken to make them aware of their goal and guide them towards it" (20:50).

The guidance which comes directly from *Allah* is known as "Revelation." It has all along been revealed to mankind through the agency of various *Anbiya*. But, unfortunately, due to the ravages of time and human tamperings with it, the text of the Scriptures, the message delivered by the pre-Islamic *Anbiya*, could not be preserved long in their original form. Eventually, about fourteen centuries ago, the complete and final version of that Guidance was revealed to mankind through *Muhammad* (PBUH), the last of the series of *Anbiya*. This version of the Divine Guidance is embodied exactly in its original form in the Quran.

2. The responsibility of the Nabee, to whom Divine Guidance was

The way we have been sliding down hill, hitting the rock bottom of degradation and failure in every field, I once asked in desperation as to why it should be so. Parwez Sahib replied : " A people who do not have respect for themselves and for others, are a doomed people. The down hill slide accelerated when, during the agitation against President Ayub, people abused him and shouted " Ayub Kutta, Hai. Hai," etc. etc. Ever since,. this has become the pattern against whosoever come next. To criticize and to disagree intellectually, or even dislodge anyone from the 'Gaddi" is one thing; to disrespect is another. Without mutual respect (those on the gaddis should also respect the commoners) a people cannot reach the higher planes of development."

x x x x x x x x x x x x x

As an executive in the Home Ministry I worked under the British Councillors; under the Interim Government when Patel was the Home Minister; then under various governments in Pakistan both inside and outside (after retirement) in the ministry, never did I suffer or things were never so oppressive and unpredictable as under President Zia. This has been the ugliest phase of my life.

x x x x x x x x x x x x x

"Just visualize a strange paradox", he once said: " We establish factories, manufacturing long cloth by crores of yards, only to be buried six feet under the ground" Indeed, to quote a wise man, it takes an extraordinary mind to see the obvious.

x x x x x x x x x x x x x x

If there is a rift and conflict among blood kinsmen, it becomes inescapably painful - if one stays close, one burns in its fire, if one stays away, one is choked in its smoke.

x x x x x x x x x x x x x x

In a stable and happy home, a member of the family can easily shed off his/her strains and stresses of the outside world as he/she enters the home, just as one sheds off the dust of ones feet on a door mat when entering the house.

FOR DARS-E-QURAN IN **DENMARK** PLEASE VISIT

AKEBERG VEIEN - 56 - OSLO -6

GALGEBERG (FOURTH FLOOR)

AT 4 PM ON FIRST SUNDAY OF THE MONTH

SOME STRAY THOUGHTSWORTH REMEMBERING.

by

Miss Shamim Anwar

Parwez Sahib's writings and lectures are already immortal, but even in an informal sitting and casual talks, one learned a lot from him and felt educated. A chance remarks, a comment, an answer to a query - one always left his presence with wanting to come back again.

Below are some of his thoughts and guidelines I can recall:-

Human beings are born with many and varied potentials and talents. If only one potential is developed at the cost of the others, and even if this development touches the heights of a genius, this unbalanced and lopsided situation becomes destructive.

x x x x x x x x x x x x

Emotional people do not produce leaders. However, they do throw up leadership of high calibre at a moment of crisis; a time in their history when it becomes a matter of life and death.

x x x x x x x x x x x x

Parwez Sahib considered study of philosophy as a prerequisite to knowledge and learning, that is, at least some acquaintance with it to read his books, or for that matter, going in for higher criticism. Then further, at one point he remarked: "Psychology, the study of human psyche, is the subject of tomorrow. Its importance for human balance, stability and happiness can hardly be over emphasized."

x x x x x x x x x x x x x

Considering his tremendous erudite and in-depth knowledge of varied subjects, I often wondered and thought loudly as to how intellectually lonely he must be. On this Parwez Sahib always modestly bypassed my remark. However once, very enthusiastically, albeit in a bemoaning manner, for it did not seem possible, he said: " If only I had the opportunity to converse and have a dialogue with Nirad Chaudhery (of " Continent of Circe" fame) what a wonderful experience it would be. Those who have read Nirad would know what he meant and missed in his life.

x x x x x x x x x x x x x

To guarantee the permanent success of a movement, of a new idea and system, it is essential that the leader harnesses the potentials of his close associates, thus quietly and unobtrusively creating a balance in their personalities.

x x x x x x x x x x x x x